تعلیم و تربیت
نیلی روشنی کا راز
صفحہ نمبر 60
صفحہ نمبر 45
یوم مئی
صفحہ نمبر 44
شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ ٹیپو سلطان
مئی 2013ء
صفحہ نمبر 4
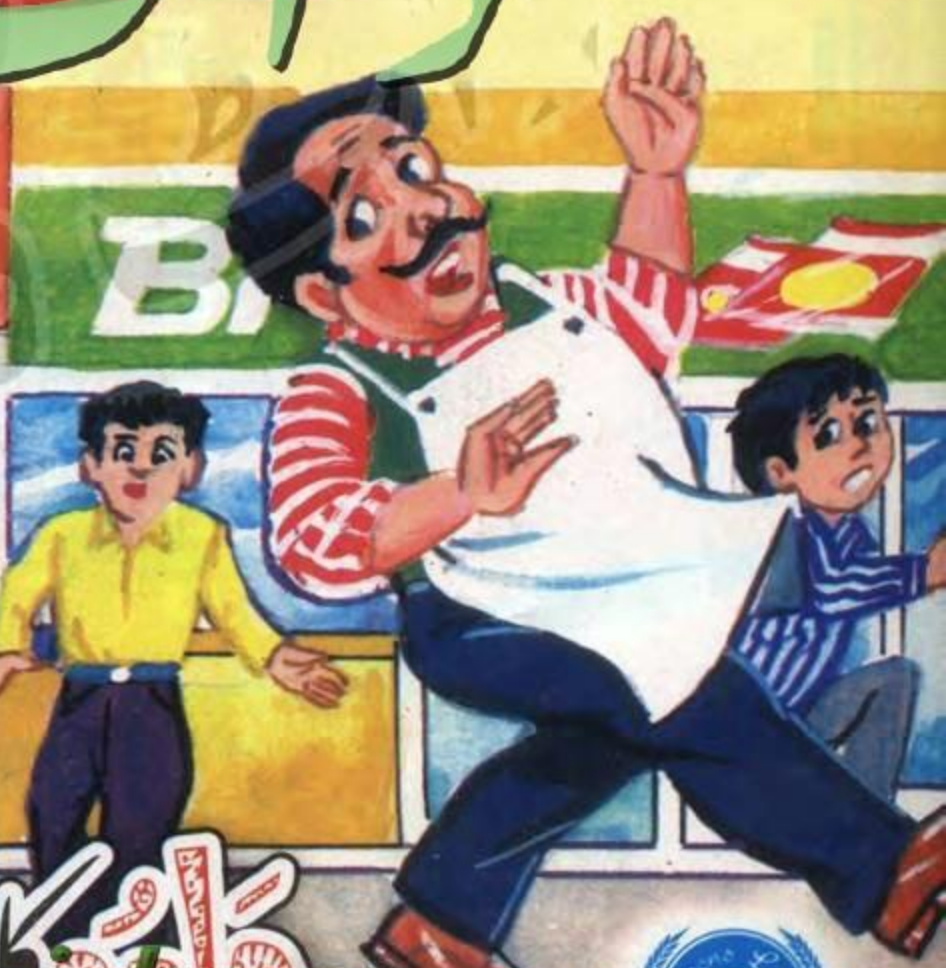
اس شمارے میں

سرورق: قرارداد پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

وطن عزیز پچھلے کئی سال سے شدید بحرانوں اور مشکل صورت حال سے دوچار ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ، بے روزگاری، آئے دن بم دھماکے، خودکش حملے اور اندرونی تنازعات نے صورت حال کو غیر یقینی دورا ہے پر لاکھڑا کیا ہے۔ انسان دشمن طاقتوں نے ہمارے خوب صورت اور آباد شہر آگ اور خون سے جہنم زار بنا دیے ہیں۔ دعا کیجیے کہ دشمنان وطن اپنے ناکام عزائم میں ہمیشہ ناکام و نامراد ہوں۔

مئی میں ملک بھر میں الیکشن ہو رہے ہیں۔ اگر آپ ووٹ ڈالنے کے حق دار ہیں تو سچے، ایمان دار اور عوام کی خدمت کرنے والوں کو ووٹ دیں تاکہ صالح قیادت کو ملک و قوم کی خدمت کا موقع ملے اور ہمارا پیارا ملک پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔

موسم تیزی سے بدل رہا ہے۔ اس بدلتے موسم میں اپنے لباس، غذا اور دھوپ چھاؤں کا خیال رکھیے گا تاکہ آپ کی صحت اور پھر تعلیم متاثر نہ ہو۔

آپ تعلیم و تربیت میں جس ذوق و شوق سے دلچسپی لیتے ہیں، اس کا ثبوت وہ ہزاروں خطوط، ای میلز اور فون کالز ہیں جو ہمیں ہر ماہ موصول ہوتے ہیں۔ آپ کے ان خطوط سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور کام کرنے کی لگن میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہر آنے والا شمارہ پچھلے شماروں سے زیادہ دلچسپ اور معلومات افزا ہو۔ آپ کی دیرینہ خواہش کے احترام میں ایک دلچسپ قسط وار ناول "نیلی روشنی کا راز" کا آغاز کر دیا گیا ہے جو یقیناً آپ کو پسند آئے گا اور ہر دفعہ پڑھنے کے بعد اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار کریں گے۔

ہمیں آپ کی قیمتی اور مفید آراء کا انتظار رہے گا۔ اپنا اور دوسروں کا بہت خیال رکھیے گا۔ ہم اپنے تمام قارئین کا خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے آئندہ تک کی اجازت چاہتے ہیں۔

فی امان اللہ! ایڈیٹر

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبدالسلام	ظہیر سلام	عابدہ اصغر	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمٹیڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔
ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

حمد باری تعالیٰ
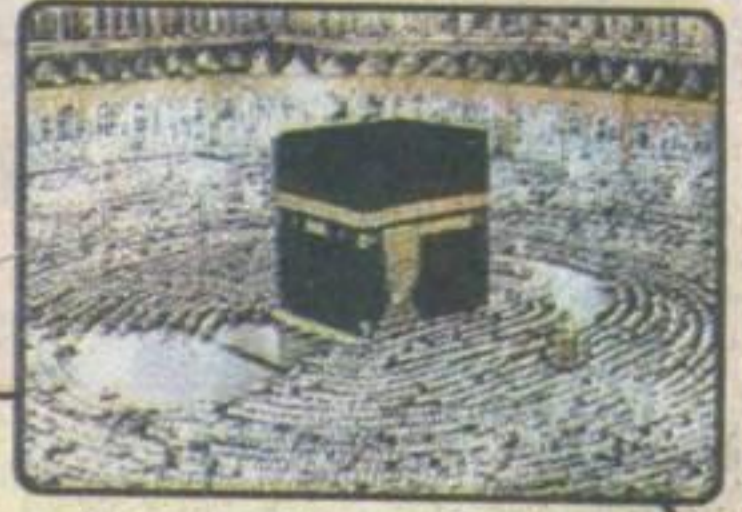
سورج چاند ستارہ تو ہے دریا گھاٹ کنارا تو ہے
خوشبو تو ہے گلشن تو ہے الجھن تو ہے سلجھن تو ہے
چاروں اور نظارا تو ہے پانی تو ہے دھارا تو ہے
بستی بستی ساری تجھ سے قریہ قریہ سارا تو ہے
اوّل تو ہے آخر تو ہے باطن تو ہے ظاہر تو ہے
ہم ہیں عاجزؔ بندے تیرے اور بندوں کا پیارا تو ہے

نعت رسول مقبول

اڑا کے لے جا مجھے اے ہوا مدینے میں
میری حیات کا ہے مدعا مدینے میں
نہیں ہے فکر کوئی اب گناہ گاروں کو
شفاعتوں کا ہے اک آسرا مدینے میں
یہ چاند بھی ہے اسی نقش پا کا اک ذرّہ
ہیں جس کے عکس سجے جا بہ جا مدینے میں
ڈبو نہ پائے گا طوفانِ غم انہیں، جن کا
ہے آسماں پہ خدا، ناخدا مدینے میں
ہیں جس کے سامنے خورشید و ماہ بھی مدھم
ہے رحمتوں کا وہ روشن دِیا مدینے میں
نہیں ہے فکر مجھے روزِ حشر کی عاجزؔ
مرے لیے ہیں شہہ دو سرا مدینے میں

افضال عاجزؔ

دو عظیم نعمتیں

محمد طیب الیاس

اللہ تعالیٰ نے اس حسین اور خوب صورت کائنات میں ہمارے لیے بے شمار نعمتیں پیدا کی ہیں جن کو اگر ہم گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں جابجا اپنی بہت سی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ آسمان کی چھت، زمین کا فرش، کرنیں بکھیرتا سورج، بارش کی بوندیں، چاندنی بکھیرتا چاند، سرسبز اور لہلہاتی کھیتیاں، سایہ دار درخت اور ذائقہ دار پھل، یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ ”اور تم نے جو کچھ مانگا اس نے اس میں سے (جو تمہارے لیے مناسب سمجھا) تمہیں دیا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار (بھی) نہیں کر سکتے۔“

(سورۂ ابراہیم۔آیت: ۳۴)

سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اور پھر بار بار فرمایا ہے کہ ”تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

یہ جملہ بار بار ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ ہمیں توجہ دلا رہے ہیں کہ اے آدم کی اولاد! تم ان نعمتوں کی قدر کرو، ان نعمتوں کو میری فرماں برداری کرنے میں خرچ کرو اور میری نافرمانی میں ان کا استعمال مت کرو۔

اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں مین سے دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں خاص طور پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں توجہ دلائی ہے۔ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں ہم بہت غفلت اور لاپرواہی برتتے ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پاک ہے:

”دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت سے لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں یعنی ان کی قدر نہیں کرتے: ایک نعمت صحت ہے اور دوسری نعمت فراغت ہے۔“

(بخاری شریف: کتاب الرقاق، حدیث نمبر ۶۴۱۲)

عام طور پر ہم نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہیں مگر ان دو عظیم نعمتوں کے بارے میں تو ہم بہت ہی غفلت برتتے ہیں۔ صحت اور تندرستی ایک عظیم نعمت ہے مگر صحت کی یہ نعمت ہمیں کب تک میسر رہے گی۔ ہم میں سے کسی کو نہیں پتا، کیوں کہ جب بیماری آتی ہے تو بتا کر نہیں آتی، اچھے بھلے ہوتے ہیں کہ اچانک بیماری میں ایسے جکڑے جاتے ہیں کہ بستر کے ہو جاتے ہیں اور پھر حسرت اور افسوس ہوتا ہے کہ کاش صحت اور تندرستی میں یہ کام کر لیتے۔

اسی طرح فراغت بھی ایک عظیم نعمت ہے۔ آج ہمیں فراغت ملتی ہے تو ہم اس کو فضول کاموں میں ضائع کر ڈالتے ہیں، وقت کا صحیح مصرف نہیں کرتے۔ پھر جب مصروف ہوتے ہیں تو وہ گزرا ہوا وقت یاد آتا ہے جس کو ہم ضائع کر چکے ہوتے ہیں لیکن ”اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔“

اس لیے ہمیں وقت کی قدر کرنی چاہیے اور اس کو فضول ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارا ایک بہت ہی قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر آپ بڑے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو یہ بات واضح نظر آئے گی کہ وہ جو کام کرتے تھے ذہنی یکسوئی سے کرتے تھے اور ان کو اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ اسی لیے دنیا آج ان کا نام عزت سے لیتی ہے اور ان کے کارناموں پر فخر کیا جاتا ہے۔

پیارے بچو!

ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہیں اور اس کی نعمتوں کی قدر کریں۔

☆☆☆

کسی چھوٹے سے قصبہ میں ایک چھوٹے قد کا جادوگر رہتا تھا۔ اُس کا نام سیمی تھا۔ وہ بہت شرارتی تھا۔ ہر وقت لوگوں کو کسی نہ کسی بہانے تنگ کر کے خوش ہوتا۔ اس کے پاس ایک جادوئی ہیٹ تھا۔ یہ سائز میں خاصا بڑا اور آگے سے خم دار تھا۔ اُس کا رنگ شوخ سرخ تھا اور اس پر لگے ہوئے پَر نیلے رنگ کے تھے۔ یہ ہیٹ جادو کی خصوصیات سے بھرپور تھا۔ جب بھی سیمی اسے سر پر اوڑھتا فوراً نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ سیمی تو غائب ہو جاتا مگر ہیٹ دکھائی دیتا رہتا اور جب سیمی ہیٹ اوڑھے چلتا تو دیکھنے والا منظر ہوتا کہ صرف ایک سرخ ہیٹ بازار میں سیمی کے قد کی اونچائی کے برابر چلا جا رہا ہے اور اس پر لگے ہوئے نیلے پَر ہوا میں لہرا رہے ہیں اور لوگ خوف زدہ ہو کر اُسے راستہ دے رہے ہیں۔

ماسی شیداں بازار کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی گیس بھرے غبارے بیچا کرتی تھی۔ بڑھاپے کا سن تھا اور موٹاپے کا یہ عالم تھا کہ اُس کا بیٹا صبح اس کی کرسی اس کے غباروں والے ٹھیلے کے ساتھ بچھا دیتا اور وہ اس پر ڈھیر ہو جاتی اور شام کو وہی بیٹا اسے سہارا دے کر کرسی سے اُٹھانے آ جاتا۔ بھاری بھر کم ہونے کی وجہ سے وہ مزید حرکات و سکنات سے قاصر تھی۔ ایک دن جب اُس نے تنہا ایک سرخ ہیٹ اپنی طرف آتے دیکھا تو جیسے اُسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ ماسی نے ایک زوردار چیخ ماری۔ بڑی مدت کے بعد کرسی سے خود بخود کھڑی ہوئی اور سامنے خالی راستے پر بھد بھد کر کے باقاعدہ دوڑنے لگی۔ اُس کے غبارے کرسی کے ساتھ بندھے ہی رہ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد جب لوگ اُسے سہارا دے کر واپس لائے تو غبارے غائب تھے۔ تاہم اتنی دیر میں سیمی صاحب ایک کلومیٹر دُور جا چکے تھے اور لوگوں کو ہیٹ پر پَروں کے علاوہ غبارے بندھے بھی نظر آ رہے تھے۔

اب وہ چوہدری الیاس کی بیکری میں داخل ہو گیا۔ چوہدری صاحب کاؤنٹر پر بیٹھے حساب کتاب میں مصروف تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بیکری کا بڑا دروازہ کھلا اور صرف ایک ہیٹ جس پر رنگ برنگے غبارے بندھے ہوئے تھے، ہوا میں تیرتا ہوا اندر آیا مگر نظر کی عینک کے باوجود انہیں کوئی انسان نظر نہیں آیا۔ البتہ کسی کے چلنے سے بوٹوں کی ٹک ٹک کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے کاؤنٹر چھوڑا اور بیکری کے عقبی دروازے سے باہر دوڑ لگا دی۔ انہیں قوی شبہ تھا کہ بینائی تو ان کی بس گزارے لائق ہے مگر اب کان بھی بجنے لگے ہیں، کیوں کہ انہیں ہیٹ کے نیچے نہ کوئی بندہ نظر

آیا اور بوٹ دیکھے بغیر ان کی ٹک ٹک بھی سننے کو ملی۔ سیمی نے پانچ منٹوں میں بیکری سے جام لگے ہوئے بن، چکن سینڈوچ اور ایک آدھ چاکلیٹ والی پیسٹری اُڑائی اور مزے سے انہیں کھاتا ہوا بازار میں آ گیا۔ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ انہیں اب ہیٹ، غبارے اور کھانے والی چیزیں ہوا میں تیرتی نظر آ رہی تھیں، حتیٰ کہ قصائی کی دکان پر بیٹھا ہوا کتا بھی دم دبا کر بھاگ نکلا۔ ورنہ عام حالات میں وہ ان چیزوں کو کسی راہ گیر کے ہاتھوں سے بھی چھین لیتا۔

انسپکٹر راغب کی آنکھیں ایسی رپورٹیں سن کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ یہ کام صرف سیمی جادوگر کر سکتا ہے، کیوں کہ اس کی جادو بھری وارداتوں کا ذکر وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ اُس نے قصبے میں سب کو بتایا کہ یہ سیمی ہو سکتا ہے۔ اس نے انہیں حکم دیا کہ جب بھی وہ پَروں والے ہیٹ کو آتے دیکھیں تو اندازے سے اس کے نیچے غائب ہونے والے سیمی جادوگر کو قابو کر لیں اور جیسے ہی وہ اُس کا ہیٹ اتاریں تو نیچے سے سیمی نمودار ہو جائے گا۔ وہ اسے پکڑ کر انسپکٹر کے حوالے کر دیں۔

لوگ ہیٹ کے دکھائی دینے کا انتظار کرنے لگے مگر یہ باتیں اُڑتی اُڑتی سیمی تک بھی جا پہنچیں تو اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے جیل کی سلاخیں اور وہاں کا اسپیشل کھانا دال روٹی نظر آنے لگا، مگر اُس کے شرارتی ذہن نے فوراً کام کیا۔ اُس نے اپنے پڑوسی ثناء اللہ کے باڑے سے اس کا سب سے بڑا بکرا شمی کھولا اور جادو کا ہیٹ اُس کے سینگوں سے باندھ دیا۔ شمی چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ سیمی نے جادو سے اس کے ذہن میں ڈال دیا کہ وہ کوئی پہلوان ہے اور قصبہ کی سڑکوں پر بھی اسے ایسے چلنا ہے جیسے کوئی پہلوان اکھاڑے جاتا ہے۔

شمی کو اللہ نے موقع دیا، وہ پہلوانوں کی طرح شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا تو ہر طرف ہاہا کار مچ گئی۔ لوگ بھاگے کہ ہیٹ کے نیچے غائب سیمی کو پکڑ لیں کیوں کہ شمی کا تو انہیں کان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پیچھے ہٹ جاؤ لوگو! اس کو مجھے پکڑنے دو۔ پیجا پہلوان نے مونچھوں کو تاؤ دے کر لوگوں کو کہا اور شمی کی طرف بڑھا۔ اُس کے موٹے پیٹ کے بل اس طرح ہلکورے لے رہے تھے جیسے سمندر میں لہریں اٹکھیلیاں کر رہی ہوں۔ پیجا پہلوان ہر وقت ایسا کام کرنے پر تیار رہتا تھا جس سے وہ مشہور ہو جائے۔

وہ شمی کے قریب گیا اور اُسے اندازے سے سیمی سمجھ کر یوں چھا مارنے لگا جیسے کھلاڑی کبڈی میں کرتے ہیں۔ شمی پہلے تو اس حرکت پر تھوڑا حیران ہوا مگر سیمی نے تو پہلے ہی اس کے ذہن میں پھونکا ہوا تھا کہ وہ قصبے کا سب سے بڑا پہلوان ہے۔ شمی نے قریب آتے پیجا پہلوان کے قیامت خیز پیٹ پر سینگوں سے ایسا کاری وار کیا کہ پہلوان کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ پہلوان صاحب قریبی گھر کے قریب کیچڑ کے گڑھے میں جا گرے جو غالباً مالک مکان نے دیواریں بنانے کے لیے بنایا ہوا تھا۔ ہمت جتا کر دوبارہ اُٹھے۔ آستینیں چڑھائیں اور دوبارہ شمی کی طرف بڑھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہیٹ آگے پیچھے ہو رہا ہے۔ وہ سمجھے کہ شاید سیمی بھاگنے کی تیاری کر رہا ہے۔ دراصل غائب شمی اپنے سم زمین میں

مار مار کر غصے سے پیجا پہلوان کے دوبارہ نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پیجا پہلوان نے اس دفعہ سیدھا ہیٹ پر جھپٹا مارا کہ ہیٹ اُترا تو سیمی نمودار ہو جائے گا مگر سیمی نے ہیٹ شمی کے سینگوں پر نہایت مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔ وہ پہلوان کے ہاتھ آیا ضرور مگر اُترا نہیں۔ شمی نے نہایت بے دردی سے اپنے سینگوں سے دو تین بے دردانہ وار پیجا پہلوان پر اور کیے۔ اُس نے بہترین کوشش کی کہ ہیٹ اس کے ہاتھ میں آ جائے، مگر شمی نے اُس کی تمام تدبیریں ناکام بنا دیں۔

اب وہ ہانپتے کانپتے لوگوں کے ہجوم میں کھڑا انہیں بتا رہا تھا کہ اُس نے محسوس کیا ہے کہ جادوگر کی چھوٹی سی دم اور بڑی عجیب وغریب داڑھی بھی ہے۔ سینگوں کا بتاتے ہوئے اسے بڑی شرم آ رہی تھی۔ اتنی دیر میں انسپکٹر راغب بھی وردی میں ملبوس وہیں آن پہنچا اور وہ ابھی سیمی کے اس طرح کے برتاؤ کا سوچ ہی رہا تھا کہ شمی سمجھا کوئی نیا دشمن آ گیا ہے۔ اُس نے انسپکٹر صاحب کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ انسپکٹر صاحب کی ٹوپی ایک ہی وار سے اُڑتے ہوئے ایک طرف جا گری اور دوسرے وار سے انسپکٹر صاحب لڑکھڑا کر گرے مگر لوگوں نے انہیں سنبھالا دیا۔ بہر کیف نہ تو شمی لوگوں کے قابو میں آیا اور نہ ہی ہیٹ۔ اب لوگوں کا جوش مدہم ہو گیا تھا اور اُس کی جگہ آہستہ آہستہ خوف نے لے لی تھی۔

تب اُدھر سے سیٹی بجاتا، گنگناتا ہوا سیمی گزرا۔ شاید ہی کسی نے اُس کی شکل پہلے سے دیکھ رکھی تھی کیوں کہ وہ تو ہر وقت جادو کا ہیٹ پہنے غائب رہتا تھا۔ اُس نے سر جھکا کر لوگوں کو سلام کیا اور ان سے ان کی مصیبت کے بارے میں دریافت کیا۔ اُس نے لوگوں کو بتایا کہ وہ بھی جادوگر ہے اور اُس کا نام دانش مند ہے۔ لوگوں نے التجا کی کہ وہ کسی طرح سیمی جادوگر کو پکڑ کر اُن کے حوالے کر دے۔ پیجا پہلوان نے تو بڑی عقیدت سے اپنی شلوار کے نیفے میں اُڑسی ہوئی تھیلی دانش مند کو پیش کی جو سونے کے سکوں سے بھری ہوئی تھی۔ پہلوان کا انگ انگ درد سے دکھ رہا تھا۔ دانش مند نے لوگوں کو بتایا کہ یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔

اب وہ لوگوں کو دکھاتے ہوئے ایسے شمی کی طرف بڑھا جیسے کسی جن کو قابو کرنے چلا ہو۔ وہ شمی کے نزدیک پہنچا تو شمی بے چارہ جو اجنبی لوگوں میں گھرا ہوا تھا، سیمی کے شناسا چہرے کو دیکھ کر اس کی بھی جان میں جان آئی اور وہ آرام سے ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کو دکھا کر اُس نے شمی کو جھڑکا جیسے وہ سیمی کو جھڑک رہا ہو اور اُسے لعن طعن کر کے شرافت سے ساتھ چلنے کو کہا۔ شمی تو پہلے ہی سیمی کے جادو کے زیر اثر تھا۔ خاموشی سے دانش مند یعنی سیمی کے پیچھے ہو لیا۔ لوگوں سے خاصا دُور آ کر سیمی نے شمی کا ہیٹ اتارا اور اُسے ثناء اللہ کے باڑے میں باندھ دیا۔

سیمی دل ہی دل میں بے وقوف پیجا پہلوان کا شکریہ ادا کر رہا تھا جس نے اُسے امیر بنا دیا تھا اور اب اُسے کسی دکان سے کچھ چرانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ پھر اُس نے پیار سے اپنے ساتھی ہیٹ کو تھپتھپایا اور اُسے سر پر اوڑھ لیا۔ لوگ دُور سے شور وغل مچاتے اُسی کی طرف آ رہے تھے۔ ایک بار پھر اُن میں سراسیمگی پھیل گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ سرخ ہیٹ پھر ان کی طرف آ رہا ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ سیمی نے دانش مند کو ہرا دیا ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

سیمی ہیٹ پہنے بڑے آرام سے لوگوں کے درمیان سے جن میں انسپکٹر راغب بھی شامل تھا، ٹہلتا ہوا گزر گیا۔ کسی کی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اُسے ہاتھ لگانے کی کوشش کرے۔ البتہ پیجا پہلوان دبے لفظوں میں لوگوں کی منتیں کر رہا تھا کہ اس ظالم سے میری سونے کے سکوں والی تھیلی تو واپس لے دو جو اس نے دانش مند سے چھینی ہے لیکن لوگ اُس کے بڑبولے پن کی وجہ سے اُسے بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرے۔

انسپکٹر راغب نے اپنی ڈائری پر سب کچھ نوٹ کیا اور اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ مستقبل میں اسے ہر قیمت پر سیمی کو پکڑنا ہے اور لوگوں سے بھی عہد لیا کہ وہ جب سیمی کو دیکھیں تو اُسے بتائیں۔ کیوں کہ اُس کا خیال تھا کہ ہیٹ کے جادو سے وہ آج بچ گیا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ امید بڑی موہوم سی ہے کیوں کہ اب بھی کوئی سیمی کو شکل سے نہیں جانتا لیکن بہر کیف آپ میں سے بھی کسی کو سیمی جادوگر کے متعلق معلومات حاصل ہوں تو مہربانی فرما کر انسپکٹر راغب کے موبائل نمبر XYZ پر اُس کی اطلاع کریں۔

مزدُور

شان مزدُور کی نرالی ہے
اِس کی عظمت بہت ہی عالی ہے
سونا، مٹی سے یہ اُگاتا ہے
یہی صحرا میں گل کِھلاتا ہے
اِس کی محنت سے اس کی عزت ہے
لائق فخر اِس کی خدمت ہے
ہے یہ معمار ہر عمارت کا
بول بالا ہے اِس کی ہمت کا
کھیت ہیں اِس کی محنتوں کا نشان
اِس کی محنت کا معترف ہے جہاں
سکھ زمانے کو بخش کر مزدور
دل میں ہوتا ہے کس قدر مسرور
ہے قناعت پسند یہ بچو
درس دیتا ہے صبر کا سب کو

ضیاء الحسن ضیاؔ

اکمل جیسے ہی دروازہ عبور کر کے باہر گلی میں آیا، اُس کا منہ بن گیا۔ پیوند لگے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں ایک بالٹی لیے، وہ لڑکا ہمیشہ کی طرح سڑک کی دوسری طرف موجود تھا اور حسب معمول غور سے اُن کی بڑی سی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ابو جی کو مخاطب کیا: ''ابو جی! آپ اُسے دیکھ رہے ہیں؟''

''کسے بیٹا!'' اشفاق صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اُس لڑکے کو۔''

''اِسے تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔''

''یہ...... یہ اکثر ہماری گلی میں ہوتا ہے۔'' اکمل نے بُرا سا منہ بنایا۔

''اچھا تو پھر؟''

''ابو جی! آپ نے اس کے کپڑے دیکھے، جیسے سرکس میں مسخرے پہنتے ہیں۔''

''بیٹا! کسی کا مذاق نہیں اُڑایا کرتے۔ بُری بات ہے۔'' انہوں نے جلدی سے کہا۔

''لیکن یہ ہماری گلی میں کیوں آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ بالٹی ہوتی ہے۔ پتا نہیں، اس میں کیا لیے پھرتا ہے؟''

اشفاق صاحب کے پاس اُس کے اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے وہ خاموش ہو رہے۔

''دیکھیں تو سہی، یہ ہماری گاڑی کو کیسے دیکھ رہا ہے۔'' اکمل کو نجانے کیوں غصہ آ رہا تھا۔

''بیٹا! تم اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو، یہ یہاں کھڑا ہوتا ہے اور بس۔'' اشفاق صاحب نے اکمل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ یہاں کھڑا ہوتا ہی کیوں ہے ابو جی، غریب کہیں کا۔'' اس نے تلملا کر کہا۔ اکمل کی حالت دیکھ کر اشفاق صاحب اُسے گاڑی میں بٹھا کر، سڑک عبور کر کے غریب اور خستہ حال لڑکے کے پاس پہنچ گئے اور پیار بھرے لہجے میں پوچھنے لگے:

''بیٹا! کیا نام ہے تمہارا اور کہاں رہتے ہو؟''

اُن کے لہجے میں ہمدردی اور پیار محسوس کر کے لڑکے نے نظر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہنے لگا:

''انکل! میرا نام رحمت ہے۔ یہاں سے تھوڑی ہی دُور واقع، غریب آباد میں میرا گھر ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں، میرے ابو جی کپڑے کی دکان پر کام کرتے ہیں، تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ اس لیے

ابو جی کی مدد کے لیے میں چنے بیچتا ہوں۔'' رحمت ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔ اس کی بات سن کر اشفاق صاحب مسکرا دیے۔
''میرا بیٹا اکمل کہتا ہے، تم اکثر اس گلی میں دیکھے گئے ہو، کیوں؟'' اشفاق صاحب نے رحمت کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔
''انکل! اس پوری گلی میں سب سے پیارا اور خوب صورت گھر آپ کا ہے، مجھے آپ کا گھر اور گاڑی بہت اچھی لگتی ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اسی وقت اکمل بھی گاڑی سے نکل کر اُن کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک غصے کے آثار تھے۔ وہ تھا تو ایک اچھا بچہ لیکن نجانے کیوں غریب لوگوں کو دیکھ کر اُسے خواہ مخواہ غصہ آ جاتا تھا۔ اشفاق صاحب اس کی اِس عادت سے آگاہ تھے لیکن وہ اُسے سمجھا نہیں پائے تھے۔
''ابو جی! آپ اس سے باتیں کیوں کرنے لگے ہیں، ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہیے۔''
اس سے پہلے کہ اشفاق صاحب بیٹے کی بات کا کوئی جواب دیتے، رحمت جلدی سے بول اُٹھا:
''بھائی جان! آپ کی گاڑی تو بہت ہی پیاری ہے۔'' لہجے میں پیار اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
''مجھے پتا ہے۔'' اکمل نے بُرا سا منہ بنایا۔ اُس کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز دیکھ کر رحمت کے چہرے پر موجود مسکراہٹ جاتی رہی۔ وہ حیرت سے اکمل کو دیکھنے لگا۔
''تم ہر روز ہمارے گھر کے سامنے آ کر، ہماری گاڑی کو کیوں گھورتے ہو۔ نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟'' اکمل نے آنکھیں نکالیں۔
اس کے تیور دیکھ کر اشفاق صاحب جلدی سے بولے:
''بیٹا! اس کا نام رحمت ہے اور یہ یہاں سے تھوڑی ہی دُور، غریب آباد میں رہتا ہے۔ بڑا محنتی ہے، چنے بیچ کر اپنے ابو جی کی مدد کرتا ہے۔ تم اپنے دوست سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہے ہو؟''
''ابو جی! یہ میرا دوست نہیں ہے، چنے بیچنے والا میرا دوست کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' اُس نے منہ بنا کر کہا۔
بیٹے کی بات سن کر وہ کٹ کر رہ گئے۔ انہوں نے اکمل کی پرورش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ اس لڑکے سے وہ روکھے لہجے میں بات کیوں کر رہا تھا، وہ سوچ رہے تھے۔ اکمل ایسا تو نہیں تھا۔ اِسے کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے رحمت کو مخاطب کیا:
''رحمت! تم جاؤ، لگتا ہے آج تمہارے دوست کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔'' اشفاق صاحب نے کہا اور واپس آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر چڑھنے سے پہلے شیشے میں سے پیچھے دیکھا۔ رحمت چہرے پر حیرت لیے وہاں اب تک موجود تھا۔ وہ تو وہاں سے چلے گئے لیکن بالکونی سے اکمل کے دادا جی رحمت کو برابر دیکھ رہے تھے۔
عشا کی نماز کے بعد اکمل حسب عادت دادا جی کے کمرے میں موجود تھا۔ وہی نہیں، اُس کی چھوٹی بہن عظمیٰ اور بڑا بھائی احمد بھی موجود تھے۔ ایک زمانہ تھا جب گھروں میں بڑے بزرگ بچوں کو پیاری پیاری کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ چھوٹے بڑے اُن کہانیوں سے اچھی اچھی باتیں سیکھا کرتے تھے۔ بڑا اچھا ماحول ہوا کرتا تھا۔ آج کے بزرگ بڑے مصروف ہو گئے ہیں۔ اُن کے پاس بچوں کو سنانے کے لیے کہانیاں تو شاید ہوں لیکن وقت نہیں ہے۔ اکمل کے دادا نے گھر میں کہانی سنانے کی روایت کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ وہ روزانہ اپنے پوتوں اور پوتی کو دلچسپ کہانی سناتے تھے۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے جب کہ بچے اُن کے سامنے قالین پر بیٹھے کہانی شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔
نویں جماعت کا طالب علم رحمت گھر میں داخل ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ امی نے اُسے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو حسب عادت لپک کر اُس کی طرف بڑھیں۔ پھر بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں۔ ان کے منہ سے نکلا:
''رحمت بیٹا! کیا ہوا، یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیسے؟''
رحمت نے اپنی امی کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا:
''امی! آج پھر اُستاد جی نے مجھے فیس نہ لانے پر چھڑی سے مارا ہے۔''
''ہائے ...... میں مرگئی ...... میرا بچہ۔'' انہوں نے سر پکڑ لیا اور پھر زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔ رحمت نے سامنے برآمدے میں موجود چارپائی پر بستہ رکھا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھا اور

نے آنکھیں صاف کر لیں۔
''اسکول سے واپسی پر میں محنت کروں گا۔ میں کام کروں گا۔''
''کیا مطلب!!'' امی نے حیرت سے رحمت کو دیکھا۔
''مطلب یہ امی، میں فارغ وقت میں کوئی کام کروں گا۔'' رحمت نے آہستہ سے کہا۔ بیٹے کی بات سن کر وہ چپ سی ہوگئیں۔ رحمت نے پیار سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولا:
''آپ فکر نہ کریں، میری پڑھائی بالکل متاثر نہیں ہوگی۔ میں اچھے نمبر ہمیشہ لوں گا۔ بس مجھے آپ کی اجازت چاہیے۔ میں پڑھائی میں محنت کروں گا اور کام میں بھی۔''
''بیٹا! میرا دل نہیں چاہ رہا کہ تم کام کرو۔''

اپنی امی کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا:
''امی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔''
''کیسا فیصلہ بیٹا؟'' وہ بیٹے کی بات سن کر اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔
''اِدھر آیئے...... بتاتا ہوں۔''
''بیٹا! میں چاہتی ہوں، تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو لیکن...... لیکن میں وقت پر تمہاری فیس ادا نہیں کر پاتی ہوں۔ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے جو پیسے ملتے ہیں، اُن میں سے گھر کا کرایہ دیتی ہوں اور جو بچ جاتے ہیں، اُن سے مہینے بھر کا راشن آ جاتا ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے حاجی صاحب کا، وہ ہم سے بجلی کا بل وصول نہیں کرتے۔ اپنی جیب سے ادا کر دیتے ہیں۔ وقت پر فیس ادا نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں ہر مہینے اُستاد جی سے مار کھانی پڑتی ہے اور یہ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔ جب سے تمہارے ابو کا انتقال ہوا ہے، دکھ اور پریشانیاں ہیں کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہیں۔ میں کیا کروں رحمت؟'' بے بسی سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
آنسو دیکھ کر رحمت تڑپ اُٹھا۔ جلدی سے بولا:
''اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے امی......''
''لیکن بیٹا! کیا فیصلہ کیا ہے تم نے، کچھ بتاؤ تو سہی۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔
''آپ میرے لیے دعا کریں، میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا، آپ کے سارے خواب سچ کروں گا، ان شاء اللہ۔''
دادا جی سانس لینے کے لیے رُکے تو تینوں بچے بے چین ہوگئے۔ عظمیٰ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:
''پھر کیا ہوا دادا جی؟''
دادا جی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر انہوں نے تپائی پر پڑا پانی کا گلاس اُٹھا لیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر انہوں نے تین سانس میں، آہستہ آہستہ پانی کو حلق سے نیچے اُتارا اور گلاس واپس تپائی پر رکھ کر بچوں کو دیکھنے لگے۔
''دادا جی! رحمت نے کیا کام شروع کیا تھا؟'' اکمل نے دلچسپی سے پوچھا۔
''اس نے آلو چھولے بیچنے شروع کر دیے۔''
''کیا؟'' وہ اُچھل پڑا۔ یک دم اس کے ذہن میں بالٹی والا لڑکا گھوم گیا تھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے دادا جی کو دیکھنے لگا۔
''رحمت کے آلو چھولے بہت مزے دار تھے۔ جلد ہی وہ شہر میں رحمت آلو چھولے والا کے نام سے مشہور ہوگیا۔ ایک دن وہ

کسی گلی میں چھولے بیچ رہا تھا۔ اس کی نظر ایک بڑی سی گاڑی پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ گاڑی بہت خوب صورت تھی۔ نجانے کیوں رحمت کا دل کیا کہ وہ اس گاڑی کو بس دیکھتا ہی رہے۔ گاڑی کے مالک کا گھر بھی شان دار تھا۔ اس گلی میں اس جیسا گھر اور کسی کا نہ تھا۔ پھر یک دم اُس کے دل میں ایک خیال آیا۔ خیال یہ تھا، جب وہ پڑھ لکھ لے گا اور بہت سارے پیسے جمع کرلے گا تو وہ بھی ایسا ہی گھر اور گاڑی خریدے گا۔"

"ہاہاہاہا...... پاگل کہیں کا۔" اچانک اکمل نے کہا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ عظمیٰ اور احمد نے اُسے دیکھا:

"کیا ہوا بھائی جان...... آپ ہنسنے کیوں لگے؟" عظمیٰ نے بُرا سا منہ بنا کر پوچھا۔

"رحمت آلو چھولے والا کی معصومیت پر۔" وہ بولا۔

"معصومیت...... کیا مطلب؟" احمد نے حیرت سے کہا۔

"آلو چھولے فروخت کرنے والا لڑکا شان دار گھر اور قیمتی گاڑی خریدنے کا خواب کیسے دیکھ سکتا ہے۔ پاگل تھا وہ رحمت۔ مجھے یقین ہے، اس کا خواب کبھی پورا نہیں ہوا ہوگا۔" اکمل طنزیہ انداز میں کہتا چلا گیا۔ وہ تصور میں اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا جو اُس کی گلی میں آلو چھولے بیچنے آتا تھا۔ اتفاق سے اس کا نام بھی رحمت ہی تھا۔ اس کی بات سن کر دادا جی چپ سے ہو گئے۔ جب وہ کافی دیر تک کچھ نہ بولے تو اکمل نے پوچھا:

"دادا جی! کیا ہوا...... آپ خاموش کیوں ہو گئے...... رحمت آلو چھولے والے کی کہانی کیوں نہیں سنا رہے؟"

"بیٹے! ایک بات تو بتاؤ۔"

"جی پوچھیں۔"

"کیا غریب لوگ اچھے خواب نہیں دیکھ سکتے...... کیا وہ اچھی چیزوں کی خواہش نہیں کر سکتے؟"

جواب میں اکمل کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ وہ چپ رہا۔ احمد نے اکمل کو گھورا اور دادا جی سے کہنے لگا:

"آپ بھائی کو چھوڑیں، یہ تو اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہی رہتا ہے۔ پھر کیا ہوا؟"

"رحمت آلو چھولے والا اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے دن رات ایک کرنے لگا۔ وقت کا پنچھی اُڑتا رہا...... دن رات بدلتے رہے۔ رحمت کی امی نے اب لوگوں کے گھروں میں کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے حالات میں بہتری آتی جا رہی تھی۔ پھر جب اُس نے بی اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تو اس کی امی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ وہ خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اُس کا بیٹا رحمت، اُس کے لیے اللہ کی رحمت بن گیا تھا۔ جب اُن کے پاس ٹھیک ٹھاک روپے جمع ہو گئے تو ایک دن رحمت نے اپنی امی سے کہا:

"امی جی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"فیصلہ؟" اس کی امی نے دُہرایا اور پھر وہ ماضی میں چلی گئی۔ پانچ سال پہلے بھی اس کے بیٹے نے ایک فیصلہ کیا تھا اور آج پھر وہ ایک فیصلہ کرنے جا رہا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے، پیار سے جوان بیٹے کی پیشانی چوم لی اور بولیں:

"کیسا فیصلہ رحمت!!"

"امی جی! میں نے بی اے کر لیا ہے، اب میں اور نہیں پڑھوں گا۔" رحمت کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"پھر کیا کرے گا؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اپنا کاروبار......امی! میں چھولے بیچنے کے علاوہ کچھ دوسرے کام بھی کرتا رہا ہوں، آپ جانتی ہی ہیں اور اب اتنے روپے جمع کر لیے ہیں کہ اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکوں۔ کیا خیال ہے آپ کا، کاروبار کر لوں؟" رحمت نے تائید طلب نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں رحمت...... اللہ کا نام لے کر قدم بڑھاؤ، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

"اور میں جانتا ہوں، ماں کی دُعا بچے کے حق میں بہت جلد قبول ہوتی ہے...... امی! میرا دوست آصف ہے نا۔"

"کیا ہوا اُسے؟" وہ گھبرا گئیں۔

"اسے کچھ نہیں ہوا۔ اس کے ابو کی جوتے بنانے کی فیکٹری ہے۔ وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں۔ میں اُن کے مشورے سے کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں۔"

''ٹھیک ہے، تم اُن سے ضرور مشورہ کرنا۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

پھر ایک دن رحمت نے آصف کے ابو کے مشورے سے اپنے کاروبار کا آغاز کر دیا۔ جذبے صادق ہوں تو اللہ کی رحمت چپکے سے ساتھ ہو لیا کرتی ہے۔ اللہ کی رحمت، رحمت پر بھی ہوئی اور اس نے چند ہی سالوں میں وہ کچھ حاصل کر لیا کہ جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔

''کیا مطلب دادا جی!!!'' اکمل حیرت سے اُچھل پڑا۔

''مطلب یہ کہ اس نے ایک شان دار گھر اور ایک قیمتی گاڑی بھی حاصل کر لی۔ اللہ پاک نے اُسے اس کی محنت کا صلہ دے دیا۔''

''اوہ...... اوہ...... دادا جی! کیا دُنیا میں ایسا ہوتا ہے؟'' اکمل حیران تھا۔

''ہوتا ہے میرے بیٹے...... ہوتا ہے۔ رحمت کی امی نے اُس کی شادی کر دی۔ اس کے دو بچے بھی ہوئے۔ بیٹے کا نام اُس نے اشفاق اور بیٹی کا نام عائشہ رکھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد رحمت کی امی اُس کا ساتھ چھوڑ کر اللہ کے پاس چلی گئیں اور وہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگا۔ اس کی زندگی محنت سے عبارت تھی۔ چوں کہ اُس نے غربت کی زندگی گزاری تھی، شاید اس لیے وہ غریبوں سے پیار کرتا تھا۔ اُن کا خیال رکھتا تھا۔ اُن کے دُکھ کو اپنا دُکھ جانتا تھا۔ اسے وہ لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے تھے جو اپنے سے کمزور لوگوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھتے تھے۔ رحمت کے دونوں بچے جب جوان ہوئے تو اس نے ان کی شادی کر دی۔ اس نے سارا کاروبار اپنے بیٹے اشفاق کے حوالے کر دیا اور خود آرام کی زندگی گزارنے لگا۔'' دادا جی کہانی سنا کر چپ ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا۔ تینوں بچے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''دادا جی! آپ نے بہت اچھی کہانی سنائی...... مجھے بہت اچھی لگی۔ رحمت نے محنت اور لگن سے اپنا خواب سچ کر دکھایا...... بہت خوب۔'' احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رحمت بہت اچھا تھا، اس نے محنت سے نہ صرف اپنی امی کے دکھ اور پریشانیاں دُور کیں بلکہ اپنا خواب بھی پورا کر لیا۔'' عظمیٰ جلدی سے بولی۔

اکمل خاموش تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

''اکمل بیٹے! آپ کو یہ کہانی کیسی لگی؟'' دادا جی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اُن کی آواز سن کر اکمل چونکا۔ پھر اس کے منہ سے نکلا:

''رحمت...... رحمت...... میں...... میں...... مجھے......''

''اچھا نہ بتاؤ، تمہیں کہانی کیسی لگی...... یہ تو پوچھ لو، رحمت اب کہاں ہے؟'' وہ مسکرائے۔

''کک...... کک...... کہاں ہے وہ دادا جی؟''

''وہ اس وقت تم سے بات کر رہا ہے......''

''کیا؟'' تینوں بچے بڑے زور سے چلائے۔ سب سے اُونچی آواز اکمل کی تھی۔ کمرے کے کھلے دروازے کے پاس کھڑے اکمل کے ابو جی یعنی اشفاق صاحب مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

اَلْبَاسِطُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(فراخی کرنے والا)

اللہ تعالیٰ ہی رزق میں فراخی دینے والے ہیں جب اللہ تعالیٰ کشادگی فرما دیں تو کوئی رکاوٹ اسے روک نہیں سکتی۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک آدمی پڑھا لکھا ہے، مگر وہ غریب ہے اور ایک آدمی ایسا ہے جسے اپنا نام تک لکھنا نہیں آتا، انگوٹھا چھاپ ہے لیکن وہ بہت امیر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نظام بڑا عجیب ہے۔ جس کے پاس تنگی ہے تو ''اَلْقَابِضُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' وہ ہی اسے بہتر جانتا ہے اور اگر کسی کے پاس مال و دولت کی فراوانی اور کشادگی ہے تو ''اَلْبَاسِطُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' ہی اسے بہتر طور پر جانتا ہے۔

دو انوکھے کردار

سہیل صاحب کے بنگلے کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ خوب صورت رنگ و روغن، فرش پر اعلیٰ قسم کے ٹائلیں، چھتوں پر آنکھیں چندھیا دینے والے فانوس، در و دیوار پر دیدہ زیب پردے لٹکے ہوئے، انتہائی قیمتی لکڑی سے بنے ہوئے کھڑکیاں دروازے، نفیس برتن، فریج، اے سی، کاریں کھڑی کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ جگہیں، غرض ہر چیز مکمل تھی اور ہر طرف کشادگی اور رزق کی فراخی تھی مگر ابھی ایک خوب صورت چمن بننا باقی تھا۔

گارڈن کے لیے ایک بڑی جگہ مخصوص کی گئی تھی۔

''ماشآء اللہ! مبارک ہو، کیا ہی خوب صورت گھر ہے۔'' سہیل صاحب کے دوست صہیب صاحب نے کہا۔

''ارے بھائی! گھر نہیں، جنت ہے جنت۔ اپنا گھر اپنی جنت۔'' سہیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں واقعی جنت کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔'' صہیب صاحب نے کہا۔

''صہیب! یار تمہاری نظر میں گارڈن بنانے کے لیے کوئی آدمی ہے؟''

''ارے ہاں! یہ سڑک پار بستی میں ایک صاحب ہے، وہ بہت ہی ماہر کاریگر ہے۔ اچھا کام کرتا ہے۔ میرے گھر کا گارڈن بھی اسی نے بنایا تھا۔'' صہیب صاحب نے انہیں بتلاتے ہوئے کہا۔

''چلو یار! اس سے ابھی ملتے ہیں۔'' سہیل نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

سہیل صاحب فوراً کام کرنے کے عادی تھے چنانچہ وہ چاچا نظام کو اپنے ساتھ ہی لے آئے۔ چاچا نظام نے گارڈن بنانے کے جتنے ضروری اوزار تھے، وہ ساتھ لے لیے تھے۔

چلچلاتی دھوپ میں چاچا نظام آرام دہ ائیر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھا جہاں گرمی کا کوئی گزر نہ تھا۔

''ہائے......!!! اس گاڑی میں کتنی ٹھنڈک ہے اور ہماری جھونپڑی کتنی گرم......''

وہ جب بنگلے نما محل میں داخل ہوا تو ہکا بکا رہ گیا۔ اتنا بڑا عالی شان محل......؟ اس نے تو ایسا گھر کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو گا۔ وہ اپنی جھونپڑی کا سوچتے ہی حسرت کرنے لگا۔ ان کے پاس اتنا مال...... اور ہمارے پاس......؟

تین ہفتوں کی مسلسل محنت سے اس نے گارڈن کا کام مکمل کر لیا۔ جب ''سلمان پیلس'' مکمل ہو گیا تو سہیل صاحب نے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔ مہمانوں کی گاڑیوں کو کھڑی کرنے کے لیے ایک بڑی جگہ مخصوص کی گئی۔ سہیل صاحب آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے۔

فوزان صاحب ایک نئے ماڈل کی بڑی گاڑی لے کر دعوت میں پہنچے تو سہیل صاحب گاڑی کو دیکھتے چلے گئے۔ وہ سوچنے لگے میرے پاس ایسی گاڑی نہیں ہے۔ میرے پاس بھی اس طرح کی گاڑی ہونی چاہیے۔ وہ سب کچھ ہونے کے باوجود نئی گاڑی کی حسرت کرنے لگا تھا۔

سہیل صاحب نے نظام چاچا کو اپنے گارڈن کی دیکھ بھال کے لیے مستقل ملازمت پر رکھ لیا تھا۔ وہ جب بھی اس محل میں آتا تو اسے اپنی گھاس پھوس سے بنی جھونپڑی یاد آ جاتی اور ناشکری کرنے لگتا۔

چاچا نظام بھول گیا تھا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا خوب شکر ادا کرو۔ ہمیشہ اپنے سے نیچے والے پر نظر رکھنی چاہیے تاکہ تمہیں شکر کی عادت پڑے اور انسان حسد سے بچ سکے۔

''مگر...... اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ایک جیسا کیوں نہیں بنایا؟ مجھے کم مال......!!'' یہ کہتے کہتے چاچا نظام رک گیا لیکن وہ ایک منظر دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا۔

سہیل صاحب کے گھر کا کام مکمل کر کے وہ سائیکل پر اپنی جھونپڑی کی طرف روانہ ہونے لگا۔ ابھی وہ گھر پہنچا ہی تھا کہ اس کی جھونپڑی کے سامنے ایک اپاہج فقیر بے ساکھی کے سہارے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کی جھگی کل رات جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ وہ کھانے پینے اور راشن خریدنے کے لیے نظام چاچا سے کچھ رقم کا سوال کرنے آیا تھا اور اس کے دروازے پر بھکاری بن کر آیا تھا۔ وہ سوچنے لگا، اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو کیا کر سکتا تھا......؟ وہ اپنی نعمتوں پر شکر کرنے لگا۔ یہ سوچ کر چاچا نظام ٹھٹکا۔

''اب بھی وقت ہے! جو کچھ میرے پاس موجود ہے اس پر شکر کروں......'' ''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے۔ غنی مال کے ساتھ شکر کرتا ہے اور فقیر صبر کرتا ہے۔ جس کے پاس فراخی ہے اس کی بھلائی بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور جس کے پاس ظاہراً تنگی ہے، اس کی بھلائی بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ وہی ذات ہے جو تنگی کرنے والا بھی ہے اور کشادگی اور فراخی دینے والا بھی۔ وہ مالک ان چیزوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

یہ منظر دیکھ کر بر وقت سبق اُس کی عقل میں آ چکا تھا۔ وہ اپنی غلط سوچ پر توبہ کرتا ہوا اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا تو یہ جھونپڑی اسے جنت محسوس ہو رہی تھی۔ ''اپنی جھونپڑی...... اپنی جنت۔'' کہہ کر وہ بھکاری کی ضرورت پوری کرنے کا انتظام کرنے لگا۔

رزق میں فراخی کے لیے یہ دُعا ہر ایک کو بتایئے۔

اللہ تعالیٰ سے اپنے رزق میں فراخی کے لیے یہ دُعا خود بھی مانگیے، اپنے بھائی، بہنوں، دوستوں اور والدین سے بھی گزارش کریں کہ وہ بھی مانگنے کا اہتمام فرمائیں:

اَللّٰھُمَّ ابْسُطْ عَلَیْنَا مِنْ بَرَکَاتِکَ وَرَحْمَتِکَ وَ فَضْلِکَ وَ رِزْقِکَ

ترجمہ: اے اللہ! آپ ہم پر اپنی برکتوں، اپنی رحمتوں، اپنے فضل اور اپنے دیئے ہوئے رزق میں فراخی نصیب فرمایئے۔

☆☆☆

جی ہاں...... یہ چیز ہی ایسی ہے کہ جس سے ہر شخص نہ صرف بہت محبت کرتا ہے بلکہ اسے ہر وقت اپنے گھر، بٹوے اور جیب میں رکھنا پسند کرتا ہے۔ انسانی ضروریات اس کے بغیر نامکمل ہیں۔ بچے بڑے لاڈ اور مان کے ساتھ اپنے امی ابو سے وصول کرتے ہیں بلکہ عید جیسے مواقع پر تو یہ بالکل نئے اور کڑکتے انداز بچوں کے ہاتھوں میں جگہ پاتے ہیں۔ اس چیز کی بے تحاشا محبت لالچ کہلاتی ہے اور بہت سے لوگ اسے ہاتھ کی میل بھی سمجھتے ہیں۔ اسے حق داروں تک پہنچانے والے کو سخی اور بے غرض و بے لوث انسان بھی کہا جاتا ہے۔

جی ہاں...... یہ سب کچھ ہم جس چیز کے متعلق کہہ رہے ہیں، آپ اسے ''کرنسی'' کے نام سے جانتے ہیں۔

کرنسی کی اہمیت صدیوں سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا لین دین بھی اسی کے ذریعے ہوتا ہے۔ جب کرنسی کا وجود نہیں تھا تو انسان ایک دوسرے سے لین دین کے لیے ''بارٹر سسٹم'' کا استعمال کرتے تھے۔ بارٹر سسٹم سے مراد ایک دوسرے کے ساتھ مختلف چیزوں کا تبادلہ ہے۔ شمالی امریکہ میں موجود لوگ تجارت پسند تھے۔ وہ مختلف جانوروں کی کھالوں، کوفی کے دانوں، تمباکو کے پتوں اور کپڑے کے ٹکڑوں کے ذریعے لین دین کرتے تھے، جب کہ بڑے تاجر سیپ کے گول دانے جن کو دھاگے میں پرو کر گلے میں مالا یا ہار کی صورت میں یا کمر پر بیلٹ کی شکل میں باندھ کر مطلوبہ اشیاء کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ سیپ کے کالے دانے جنہیں سوکن موکس (Sucken Mocus) کہا جاتا تھا، جس بیوپاری کے پاس ہوتے تھے، اسے بہت بڑا تاجر سمجھا جاتا تھا۔ سیپ کے ان کالے دانوں کو بطور زیورات بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ جس شخص کے پاس کالے اور سفید سیپ کے موتی جتنی زیادہ مقدار میں ہوتے تھے، اسے اپنے دور کا اتنا ہی زیادہ امیر ترین شخص تصور کیا جاتا تھا۔

کرنسی کی کہانی اس کی تاریخ پیدائش سے ہی شروع ہوتی ہے۔ 812ء کو یہ وجود میں آئی اور اس کا نام ''کرنسی نوٹ'' پڑا۔ کرنسی کی پیدائش کا علاقہ چین تھا جب کہ اس کا مستقل آغاز 970ء میں ہوا۔ اس کے بعد کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ 1294 - 1214ء کے درمیان قبلائی خان اور منگول خان نے چین سے تجارتی مراسم بڑھانے کے لیے کاغذ کی شکل میں اس کا استعمال کیا۔

ایک اطالوی سوداگر اور بہت مشہور سیاح مارکو پولو (Marco Polo) نے اپنی زندگی کے تقریباً سترہ برس منگول خان کی خدمت میں گزارے۔ مارکو پولو جب 1295ء میں یورپ واپس آیا تو اپنے سفر ناموں میں "باب کرنسی" کی تصدیق کی۔ یہاں یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ کرنسی نوٹوں کی ابتداء چین سے ہی ہوئی اور اس بات کی تصدیق یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ دُنیا کا سب سے لمبا اور چوڑا کرنسی نوٹ چین کے حکمران "تینگ" کے دورِ حکومت 1399 - 1368ء میں جاری ہوا۔ اس کرنسی نوٹ کا نام ون کوون (One Cowan) تھا جو 9 انچ لمبا اور 13 انچ چوڑا تھا جب کہ اس کا وزن 5 کلوگرام تھا۔

جیسے کرنسی نوٹوں کی ابتدا پہلی مرتبہ چین سے ہوئی، اسی طرح چینی حکمرانوں نے ہی 1330ء میں کانسی کے بنے سکے کاروباری دُنیا میں متعارف کرائے۔ ان چپٹے سکوں میں ایک گول دائرہ نما سوراخ ہوتا تھا جس کی وجہ سے ان کو ہار کی شکل میں گلے میں پہنا جاتا تھا تاکہ تجارتی لین دین میں آسانی رہے۔ اٹلی نے 1492ء میں کانسی کا ایک سکہ متعارف کرایا مگر یہ 2730 گرام وزنی ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکا اور تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔ کوڑی کو دُنیا کی سب سے قدیم ترین دھاتی کرنسی کہا جاتا ہے۔ 1492ء تک ایشیائی، یورپی اور افریقی ممالک کی منڈیوں میں اسی کا استعمال عام تھا۔ مغل حکمرانوں کے نزدیک ایک کوڑی کی قدر روپے کا 0.00039 حصہ تھی۔ امریکی تجارتی منڈیوں میں بھی اس کے شواہد ملتے ہیں مگر آج تک اس بات کی تصدیق نہ ہوسکی کہ یورپ اور امریکہ میں کوڑی کی آمد کب ہوئی؟ 1479-1458ء کے دوران سونے کے سکوں کو تجارتی منڈیوں میں متعارف کرا کر کاروباری دُنیا میں ایک نئی جدت پیدا کی گئی۔ اس کام کا سہرا ایراگون کے مقبول حکمران جان (Jaan) کے سر جاتا ہے۔ ساٹرا میں 1297ء اور 1760ء کے درمیان میں صرف 80 گرام سونے کا ماس (Maas) نامی سکہ جاری ہوا، جسے دُنیا کا سب سے چھوٹا سونے کا سکہ مانا جاتا ہے۔ 1336ء میں وجے نگر (Vijay Nagar) نامی ہندوستان کے جنوبی حصے کے ایک حکمران نے قیتم (Ketam) نامی سونے کا صرف 3 گرام وزنی سکہ بنایا۔ اس کے بعد 1540-1530ء کے دوران ایک انگریز حکمران ہنری ہفتم نے شلنگ نامی دُنیا کا پہلا چاندی کا سکہ متعارف کرایا۔ اس سکے کو بہت خوب صورت نقش و نگار سے مزین کیا گیا۔ اسے ایک ماہر نقاش الیگزینڈر ڈی بروکس نے ڈیزائن کیا۔ اس سکے کے عین درمیان میں ہنری ہفتم کی تصویر کندہ کی گئی۔ چاندی کے اس سکے کو تجارتی دُنیا میں بہت عروج ملا۔ یہ آج کل بھی انگلینڈ میں قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد 1526ء میں ہنری ہشتم نے اپنے دورِ حکومت میں انوکھا اور نئے نظام کا سکہ رائج کیا۔ اُس کی اس نئی کوشش کو Crown of the rose کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چونکہ Crown of the rose فرانسیسی سکے (Acu an Soleil) کے مقابلہ میں لایا گیا، اس لیے اسے عوامی اور کاروباری دُنیا میں پذیرائی نہ مل سکی۔ یوں اس کے فوراً بعد کراؤن آف دی ڈبل روز (Crown of the double rose) نامی 22 قیراط کا سکہ متعارف ہوا، جو بے حد مقبول ہوا۔ اس سے پہلے انگلستان میں ہمیشہ سونے کے سکے کی کوالٹی 23 قیراط ہوتی تھی۔ براعظم ایشیا کی تجارتی منڈیوں نے ابتدا ہی سے دُنیا بھر میں اپنا سکہ جمایا ہوا تھا۔ یہاں بھی چاندی، کانسی اور دھات کی بنی کرنسی استعمال ہوتی رہی۔ پندرہویں صدی کے شروع میں تاجروں نے یہاں بٹن اور تانبے (کاپر) کے بنے دھاتی سکے کا استعمال عام کر دیا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ گجرات میں بادام کے بیجوں سے بھی تجارت میں کرنسی کے طور پر استعمال ہوا۔ آج ڈالر کا دور ہے۔ ڈالر ہر ملک میں قابل قبول کرنسی ہے۔ دُنیا بھر میں تجارتی معاہدے ڈالر کی بنیاد پر طے پاتے ہیں۔ خواہ یہ معاہدے انفرادی سطح پر ہوں یا اجتماعی سطح پر۔ 1999ء میں یورپی یونین نے ڈالر کے مقابلے میں ایک مشترکہ کرنسی یورو کا اجراء کیا جو ڈالر کے مقابلے میں کسی مقام پر تو نہ پہنچ سکی مگر ڈالر کو ایک جھٹکا ضرور لگا۔

پاکستانی کرنسی یعنی روپے کی ابتدا 1948ء کو ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے نقوش میں تبدیلی لائی جاتی رہی۔ مختلف ممالک کی کرنسی مختلف ہے جو معلومات کے لیے آگے درج ہے۔

ممالک	کرنسی	ممالک	کرنسی	ممالک	کرنسی
پاکستان	روپیہ	سری لنکا	روپیہ	برازیل	ریز
سعودی عرب	ریال	وینزویلا	بولیور	چلی	پیوس
بنگلہ دیش	ٹکا	سوئٹزر لینڈ	فرانک	چین	یوان
برونائی	ڈالر	تھائی لینڈ	بھات	آسٹریلیا	ڈالر
بحرین	دینار	ارجنٹینا	پیوس	آئس لینڈ	کرونز
ہندوستان	روپیہ	کولمبیا	پیوس	اسرائیل	شیکلز
ایران	ریال	ڈنمارک	کرونز	کوریا	وان
انڈونیشیا	روپیہ	ہنگری	فورنٹ	کینیڈا	ڈالر
عراق	دینار	متحدہ عرب امارات	درہم	مالٹا	لیری
کویت	دینار	زیخ	کورونی	جنوبی افریقہ	رینڈ
ترکی	لیرا	یورپ	یورو	سویڈن	کرونز
عمان	ریال	امریکہ	ڈالر	نیپال	روپیہ
ملائشیا	رنگٹ	برطانیہ	پاؤنڈ اسٹرلنگ	لیبیا	دینار
قطر	ریال	جاپان	ین	ناروے	کرونز
سنگاپور	ڈالر	بوٹسوانا	پلا	نیوزی لینڈ	ڈالر

کھانے پینے کے آداب

● کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لیجیے۔ طہارت اور نظافت کا تقاضا ہے کہ کھانے میں پڑنے والے ہاتھوں کی طرف سے طبیعت مطمئن ہو۔ ● بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھ کر کھانا شروع کیجیے اور اگر بھول جائیں تو یاد آنے پر بِسۡمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ کہہ لیجیے۔ یاد رکھیے کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا اس کو شیطان اپنے لیے جائز کر لیتا ہے۔ ● کھانے کے لیے ٹیک لگا کر نہ بیٹھیے۔ اکڑوں بیٹھیے یا دو زانو ہو کر بیٹھیے یا ایک گھٹنا بچھا کر اور ایک کھڑا کر کے بیٹھیے، خدا کے رسول ﷺ اسی طرح بیٹھتے تھے۔ ● ہمیشہ سیدھے ہاتھ سے کھایئے۔ ● تین انگلیوں سے کھایئے اور اگر ضرورت ہو تو چھنگلی چھوڑ کر چار انگلیوں سے کام لیجیے۔ ● نوالا نہ زیادہ بڑا لیجیے اور نہ چھوٹا اور ایک نوالا نگلنے کے بعد ہی دوسرا نوالا منہ میں دیجیے۔ ● روٹی سے انگلیاں ہرگز صاف نہ کیجیے، یہ بڑی گھناؤنی عادت ہے۔ ● روٹیوں کو جھاڑنے اور پٹخنے سے بھی پرہیز کیجیے۔ ● پلیٹ میں اپنی طرف سے کنارے سے کھایئے۔ نہ بیچ میں ہاتھ ڈالیے اور نہ دوسروں کی طرف سے کھایئے۔ ● نوالا گر جائے تو اٹھا کر صاف کر لیجیے یا دھو لیجیے اور کھا لیجیے۔ ● کھانے میں کبھی عیب نہ نکالیے۔ ● بہت گرم جلتا ہوا کھانا نہ کھایئے۔ ● کھانے کے دوران باتیں کرنے سے پرہیز کیجیے۔ ● بلاضرورت کھانے کو نہ سونگھیے، کھانے کے دوران نہ بار بار اس طرح منہ کھولیے کہ چبتا ہوا کھانا نظر آئے اور نہ بار بار منہ میں انگلی ڈال کر دانتوں میں سے کچھ نکالیے، اس سے دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو گھن آتی ہے۔ ● کھانا بھی بیٹھ کر کھایئے اور پانی بھی بیٹھ کر پیجیے۔ ● کھانے پینے کی چیزوں پر پھونک نہ ماریئے، اندر سے آنے والی سانس گندی اور زہریلی ہوتی ہے۔ ● پانی تین سانس میں ٹھہر ٹھہر کر پیجیے۔ ● اجتماعی کھانے میں سب کے ساتھ اٹھیے۔ ● کھانے سے فارغ ہو کر انگلیاں چاٹ لیجیے اور پھر ہاتھ دھو لیجیے۔ ● کھانے سے فارغ ہو کر یہ دعا پڑھیے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ اَطۡعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ۔ "حمد و ثنا اس خدا کے لیے جس نے ہمیں کھلایا اور جس نے ہمیں پلایا اور جس نے ہمیں مسلمانوں میں سے بنایا۔"

کھیل دس منٹ کا

ک	ع	ف	ر	د	ن	ق	چ	ل	ا
د	ڑ	م	ط	ٹ	ش	ہ	ث	ب	ک
و	ٹ	ب	ے	ن	گ	ن	ی	ظ	چ
ث	ز	ء	ف	ط	و	ق	ل	ش	ن
ے	ل	ے	ر	ک	غ	ب	م	ڈ	ا
ر	س	ط	ا	ن	ی	ع	ج	ظ	ر
ٹ	گ	ا	ج	ر	گ	ش	ل	و	خ
ن	غ	ل	ط	ڑ	ف	ذ	ش	م	ب
ڈ	ق	پ	ا	ل	ک	ع	گ	ز	ہ
ے	س	ث	چ	ر	ٹ	م	ے	غ	س

آپ نے حروف ملا کر سبزیوں کے دس نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے، وہ یہ ہیں:

بینگن، شلجم، کریلے، پالک، چقندر، کچنار، گاجر، مٹر، کدو، ٹنڈے

ایمان دار کھولا

نظر زیدی

بہت دن پہلے کی بات ہے، ایک بچہ جنگل میں بکریاں چرا رہا تھا۔ یہ بچہ یوں تو ایک عزت والے خاندان کا تھا۔ اس کے بزرگ بڑے سردار مانے جاتے تھے اور علاقے کا ہر شخص اُن کا حکم مانتا تھا، لیکن یہ بچہ بہت غریب تھا اور اس کی غربت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے والد اور والدہ دونوں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے چچا کے گھر رہتا تھا اور کچھ پیسے لے کر بستی کے لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

یہ بچہ غریب ضرور تھا لیکن اس کی عادتیں ایسی اچھی تھیں کہ ہر شخص اس کی تعریف کرتا تھا اور سچے دل سے اسے اچھا جانتا تھا۔

بستی کے عام بچے ہر وقت کھیل کود میں مصروف رہتے تھے لیکن وہ ان میں کبھی شامل نہ ہوتا تھا، نہ کبھی کسی قسم کی شرارت کرتا تھا۔ اس کا قاعدہ تھا کہ بڑی عمر کا جو آدمی ملتا، اُسے بڑے ادب سے سلام کرتا اور اگر کوئی شخص کسی طرح کا کام کرنے کو کہتا تو فوراً کر دیتا۔

ایک دن یہ اچھا بچہ صبح سے شام تک بہت محنت سے بکریاں چراتا رہا۔ جب شام آئی تو اس نے اپنی بکریوں کو اکٹھا کیا اور بستی کی طرف چلا لیکن جب اُس نے بکریوں اور ان کے بچوں کی گنتی کی تو معلوم ہوا بکری کا ایک بچہ کم ہے۔ اس بچے کی طرح جنگل میں کئی اور لڑکے بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کا یہ حال تھا کہ اگر کبھی ان کے ریوڑ کا کوئی بچہ یا بکری گم ہو جاتی تو پروا بھی نہ کرتے۔ مالک سے کہہ دیتے کہ بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔ ہم نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

یہ اچھا بچہ بھی بکری کے مالک سے یہی کہہ سکتا تھا لیکن اسے یہ بات معلوم نہ تھی کہ بچہ کس طرح گم ہوا۔ اگر وہ یہ کہتا کہ بکری کے بچے کو بھیڑیا لے گیا ہے تو یہ جھوٹ ہوتا اور جھوٹ بولنا اُسے بالکل پسند نہ تھا۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک بکری کے بچے کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو گا کہ وہ کہاں گیا، گھر نہ جاؤں گا۔ اسے ڈھونڈتا رہوں گا۔

ساتھی گڈریوں نے اس سے کہا کہ کیوں پریشان ہوتے ہو، مالک سے کہہ دینا کہ بکری کے بچے کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا لیکن اس نے یہ بات نہ مانی۔ اس نے اپنی بکریاں دوسرے گڈریوں کے ساتھ بستی کی طرف روانہ کر دیں اور خود بکری کے بچے کو ڈھونڈنے لگا۔

یہ واقعہ ملک عرب کا ہے۔ اب تو خدا کے فضل سے وہاں بہت رونق ہے۔ پکی سڑکیں بن گئی ہیں اور بہت سے شان دار شہر آباد ہو گئے ہیں، لیکن پرانے زمانے میں یہ ملک ایسا آباد نہ تھا۔ بس گنتی کی چند بستیاں تھیں اور حالت یہ تھی کہ سورج ڈوبتے ہی جنگلی جانور شکار کی تلاش میں اپنے ٹھکانوں سے باہر نکل آتے تھے۔

جس جنگل میں یہ اچھا بچہ بکریاں چرایا کرتا تھا، وہ بہت ڈراؤنا تھا۔ سورج ڈوبنے کے بعد تو وہاں رُکنا بہت ہی خطرے کی بات تھی، لیکن وہ بہادر اور اچھا بچہ ذرا نہ گھبرایا۔ برابر بکری کے بچے کو تلاش کرتا رہا اور اس وقت گھر لوٹا جب وہ مل گیا۔

جانتے ہو یہ شریف، بہادر اور ایمان دار بچہ کون تھا؟

اچھے بچو! یہ ننھا گڈریا وہ تھا جو آگے چل کر تمام دنیا کا سردار بنا، ساری دنیا کا آقا کہلایا اور سب نبیوں کا سردار مانا گیا۔

اس کا مبارک نام ہے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

☆☆☆

چچا تیز گام نے سائیکل چلائی

محمد نعیم عالم

چچا تیز گام ایک شان سے گھر سے نکلے، سفید لٹھے کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ انھوں نے زیب تن کیا ہوا تھا جب کہ پاؤں میں سلیم شاہی جوتے تھے۔ آج وہ اپنے مکمل ''نوابانہ'' لباس میں تھے۔ گھر سے باہر نکل کر انھوں نے بڑے ہی فخر سے گردن اکڑا کر اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ انداز کچھ یوں تھا جیسے دُنیا فتح کرنے نکلے ہوں لیکن وہ دُنیا نہیں، دراصل ایک عدد سائیکل فتح کرنے نکل رہے تھے جسے جمن اور استاد دروازے کے سامنے گلی میں یوں مضبوطی سے پکڑے کھڑے تھے کہ اگر انھوں نے ذرا بھی ہاتھ ہلکا رکھا تو سائیکل کسی سرکش گھوڑے کی طرح رسّا ''تڑوا'' کر بھاگ جائے گی۔ سائیکل کی صرف شکل وصورت سائیکل والی تھی، ورنہ دیکھنے میں تو وہ کسی عجائب گھر سے چرایا ہوا ''سہراب'' کا پرانا ماڈل لگ رہی تھی۔

''ہاں تو جمن......! ہماری سائیکل تیار ہے۔'' چچا تیز گام اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولے۔

''جی ہاں مالک!'' جمن نے گریس لگے ہاتھوں سے سائیکل کی گدی کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ہوں......!'' چچا تیز گام سائیکل کا جائزہ لینے لگے۔ جمن اور استاد نے مٹی کا تیل لگانے کی بجائے سائیکل کو مٹی کے تیل میں نہلا دیا تھا۔

وہ نہلاتے نہ تو اور کیا کرتے، کیوں کہ برسوں سے زنگ آلود پرزوں کو ''رواں'' کرنے کے لیے وہ اس سائیکل کو تیل کے کنویں میں غوطے لگواتے تو بھی کم تھا۔

''جمن......! استاد......! تم دونوں سائیکل کو پکڑ کر رکھو، ہم اس پر سوار ہوتے ہیں۔'' چچا تیز گام سائیکل کا جائزہ لے چکے تو بولے۔

جمن نے پھرتی سے سائیکل کا پچھلا حصہ قابو کیا جب کہ استاد سائیکل کے آگے کھڑا ہینڈل کو دونوں ہاتھوں سے یوں پکڑے کھڑا تھا جیسے وہ سائیکل نہ ہو، بل فائٹنگ کا کوئی گینڈا ہو۔

''دیکھو...... سائیکل کو ذرا دھیان سے پکڑنا۔'' چچا تیز گام پاؤں پیڈل پر رکھتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے مالک! آپ بے فکر ہو کر بیٹھیں۔ سائیکل کی کیا مجال کہ چوں بھی کرے۔'' استاد چہک کر بولا۔

استاد کی بات سن کر چچا تیز گام کو حوصلہ ہوا۔ انھوں نے اپنا بایاں پاؤں پیڈل پر رکھا اور دایاں پاؤں گدی کے اوپر سے گھماتے ہوئے دوسرے پیڈل پر رکھ کر وہ ابھی گدی پر براجمان ہوئے ہی تھے کہ اچانک گھر سے بیگم صاحبہ کی زوردار آواز سنائی دی۔

''جمن......! او جمن......! استاد! کہاں مر گئے ہو دونوں۔''

''ب...... بیگم صاحبہ!...... ہم...... ہم...... یہاں ہیں۔'' جمن اور استاد گھبرا کر بولے۔ اس گھبراہٹ میں ان کے ہاتھ سائیکل پر جمے نہ رہ سکے لہٰذا چند لمحوں بعد منظر کچھ یوں تھا، استاد سائیکل کے آگے آڑھا ترچھا پڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ سائیکل کے چکے کے نیچے تھی، جب کہ جمن پچھلے ٹائر کے نیچے اپنا پاؤں پھنسائے بیٹھا تھا۔ رہے چچا تیز گام...... تو ان کا انداز سب سے نرالا تھا۔ انھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سائیکل کو سڑک پر لٹا کر چلانے کی مشق کر رہے ہوں۔ وہ اسی طرح گدی پر براجمان تھے۔ ان کی ایک ٹانگ سائیکل کے نیچے تھی جب کہ دوسری سائیکل کے اوپر ہی

پیڈل پر تھی۔

''کم بختو......! نانہجارو......! ہمیں گرا دیا نا......! آ......ہا۔ گدھو! اب یوں مُردوں کی طرح کیوں پڑے ہوئے ہو، ہمیں یہاں سے باہر نکالو۔'' چچا تیز گام زور زور سے چلاتے ہوئے بولے۔

''مم...... مالک...... وہ...... وہ...... ہم ہم...... خود پھنسے ہوئے ہیں۔'' استاد مسمسی صورت بنا کر بولا۔

''ارے...... ہائیں......! یہ کیا......؟ یہ آپ لوگ سائیکل سے کشتی کیوں کر رہے ہیں......؟'' بیگم جیسے ہی جمن کی آواز سن کر باہر نکلیں ان کو یوں سائیکل کے نیچے آڑھے ترچھے پڑے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''بیگم تم بھی کمال کرتی ہو بھلا۔ سائیکل بھی کوئی کشتی کرنے کی چیز ہے۔''

''آ......ہ، بیگم! باتیں چھوڑو اور جلدی سے ہمیں نکالو۔ ان سستی کے ماروں سے تو خود ہی نہیں اٹھا جا رہا۔ یہ ہمیں کیا اٹھائیں گے۔'' چچا تیز گام درد سے کراہتے ہوئے بولے۔ سائیکل تھی تو پرانے ماڈل کی لیکن کافی بھاری تھی۔ ان کی ٹانگ کا کچومر نکلا جا رہا تھا۔ بیگم نے بڑی مشکل سے ان کے اوپر سے سائیکل کو کھینچ کر پرے کیا۔ جیسے ہی چچا تیز گام کی ٹانگ سائیکل کے نیچے سے نکلی، وہ تیزی سے اٹھے۔

''چرر......رر۔'' ایک زوردار آواز گونجتی چلی گئی۔

''ارے...... ہائیں، یہ آواز کس چیز کی ہے؟ کہیں ہماری سائیکل پنکچر......'' چچا تیز گام کہتے کہتے رک گئے، کیوں کہ ان کی سائیکل پنکچر نہیں ہوئی تھی، بلکہ شیروانی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ تیزی سے اٹھتے ہوئے وہ یہ بھول گئے تھے کہ گدی پر فوم کی جگہ بس چند سپرنگ ہی لگے ہوئے تھے۔ ان کی شیروانی ایک سپرنگ میں الجھ گئی تھی۔ وہ آؤ اور تاؤ دیکھے بغیر اٹھے تھے، اس لیے ان کی شیروانی درمیان سے دو ٹکڑے ہو کر جبے کا منظر پیش کر رہی تھی۔

''لو...... ہماری جان کے دشمنو! تم خوش ہو جاؤ۔ کم بختو! اُلو کے پٹھو! ہماری شیروانی کو پھڑوا دیا نا۔'' چچا تیز گام غصے میں بھرے جمن اور استاد پر برس پڑے۔

''اب زمین پر پڑے خاک چاٹتے رہو گے یا اٹھو گے بھی۔ چلو اٹھو! اور سائیکل کو پکڑ کر رکھو! ہم بھی آج سائیکل چلا کر ہی دکھائیں گے۔'' چچا تیز گام پر گویا سائیکل چلانے کا بھوت ہی سوار ہو گیا تھا۔ بیگم دل ہی دل میں جلی بھنی یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ شیروانی کا حال دیکھ کر ان کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا لیکن ان کو معلوم تھا کہ چچا تیز گام سے بات کرنا فضول ہے۔ جب وہ ایک کام کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو پھر کسی کی بھی نہیں سنتے۔ لہٰذا بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی واپس گھر میں چلی گئیں۔ چچا تیز گام ایک بار پھر نئے جوش و جذبے کے ساتھ سائیکل کی طرف بڑھے۔ حال یہ تھا کہ ان کی دو ٹکڑے ہوئی شیروانی کے دونوں حصے دائیں بائیں تیز چلتی ہوئی ہوا سے اڑ رہے تھے۔ ٹوپی کا پھندنا پیچھے کی بجائے ماتھے پہ جھوم رہا تھا، کیوں کہ اٹھتے ہی انھوں نے یہ دیکھے بغیر کہ ٹوپی الٹی ہے یا سیدھی...... اپنے سر پر جما لی تھی۔

چچا تیز گام کو سائیکل کا شوق دراصل پہلوان جی کی سائیکل دیکھ کر ہوا تھا۔ پہلوان جی ایک عدد نئی نویلی سائیکل لائے تھے۔

''واہ...... بھئی واہ...... پہلوان جی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ زمانے کی تیزی کا ساتھ دینے کے لیے لوگ کاریں، موٹر سائیکلیں، ہیلی کاپٹر اور ہوائی جہاز خرید رہے ہیں، ایک آپ ہیں کہ اس جدید دور میں بھی خرید کر لائے بھی تو کیا...... ایک عدد سائیکل۔'' چچا تیز گام برا سا منہ بنا کر بولے۔

''سی این جی ملتی نہیں، پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں۔ موٹر کاریں خرید کر کیا ان کا اچار ڈالیں۔ اس سائیکل کا کم از کم یہ فائدہ تو ہے کہ اس میں سی این جی ڈلتی ہے اور نہ پٹرول، ڈیزل...... بس ہوا بھری اور چل پڑے گویا یہ ہوائی سواری ہے...... میں نے تو روز روز کی سی این جی کی ہڑتالوں، پٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے تنگ آ کر یہ خریدی ہے۔ کل میں نے اپنے سسرال جانا تھا۔ ایک گھنٹہ بس سٹاپ پر کھڑا رہا، مجال ہے جو کوئی وین یا بس آئی ہو۔ اگر کوئی بھول کر آئی بھی تو اس میں سواریاں بیٹھی نہیں ہوئی تھیں بلکہ جانوروں کی طرح ٹھنسی ہوئی تھیں۔'' پہلوان جی پر کل کے واقعہ کا کچھ زیادہ ہی اثر ہوا تھا۔ اسی لیے جلے بھنے بیٹھے تھے۔

سائیکل کے اتنے سارے فوائد سننے کے بعد بھی چچا تیز گام پر

سائیکل کا بھوت سوار نہ ہو، بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ بیگم نے بہت کہا کہ اس عمر میں سائیکل کے چونچلے آپ کو زیب نہیں دیتے اور آپ کو سائیکل چلانی بھی نہیں آتی۔

"بیگم! تم بھی کمال کرتی ہو۔ مانا کہ ہم نے کبھی سائیکل جیسی چھوٹی موٹی سواری نہیں چلائی۔ ہم جدی پشتی نواب ہیں۔ اس لیے ہمیشہ نوابوں والی سواریاں...... جیپ، کار، موٹر سائیکل، بس ہی چلائی ہیں لیکن اب ہم اتنے بھی اناڑی نہیں کہ ایک چھوٹی سی سائیکل بھی نہ چلاسکیں۔" چچا تیز گام روانی میں بولتے چلے گئے۔

"مالک! آپ نے بس بھی چلائی ہے۔ مطلب آپ بس ڈرائیور بھی رہے ہیں۔" استاد حیرت سے بولا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا...... بھلا کبھی نواب بھی بس ڈرائیور ہوتے ہیں۔ وہ بس تو ہم نے ویسے ہی شوقیہ طور پر چلائی تھی۔" چچا تیز گام جمن کو گھورتے ہوئے بولے۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا اور عصر کے بعد وہ اپنے دوست گلو میاں کے پاس جاتے تھے۔ اس لیے سائیکل خریدنے کا پروگرام کل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ گلو میاں کے پاس پہنچ کر چچا تیز گام نے اس کو بھی اپنے سائیکل خریدنے کے بارے میں بتایا۔

"ہوں......! تو تم سائیکل خریدنا چاہتے ہو۔" گلو میاں کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "میرا ایک مشورہ ہے اگر مانو تو...... اور وہ یہ کہ تم نئی سائیکل ہرگز مت خریدنا، بلکہ کوئی پرانی دیکھ کر خرید لو۔"

"کیوں......! بھلا نئی خریدنے میں کیا قباحت ہے......؟" چچا تیز گام حیرت سے گلو میاں کو تکتے ہوئے بولے۔

"دیکھو! میاں تیز گام! نئی سائیکل کی سب سے بڑی خرابی تو ہے کہ پرانی ہو جاتی ہے، ملتی بھی مہنگی ہے اور اتنے بہت سے روپے خرچ کرنے کے بعد چلاتے ہوئے مستقل دھڑکا لگا رہتا ہے بقول شخصے۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

تم تو ویسے بھی سائیکل چلانے کے بارے میں نوآموز ہو۔ تمہارے لیے تو پرانی ہی بہتر رہے گی۔ اگر سائیکل نئی ہو اور کوئی مانگنے آئے تو آدمی انکار بھی نہیں کر سکتا۔ مطلب کوئی بہانہ نہیں بنا سکتا کہ بریک ٹھیک نہیں یا گدی خراب ہے وغیرہ وغیرہ۔ نئی چیز کے چوری ہونے کا ہر وقت خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ جہاں بھی جاؤ لاک لگانے اور محفوظ جگہ پر کھڑی کرنے کی فکر مستقل دامن گیر ہوتی ہے۔ یوں لاک کرنے اور اسے کھولنے میں بہت زیادہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ تم تو ہو بھی تیز گام، ہر کام تیز کرنے کے عادی ہو۔ تم بھلا اس کے اتنے نخرے کیسے برداشت کر سکو گے۔" گلو میاں نئی سائیکل کے نقصانات انگلیوں پر گنواتے ہوئے بولے۔

"اوہ......! بھائی گلو، نئی سائیکل کے تو واقعی بہت سے نقصانات ہیں۔"

"اف خدا! اگر آپ مجھے نہ بتاتے تو میں اس نقصانات کی گٹھڑی کو کل خرید کر لے آتا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" آخری

نقصان نے چچا تیز گام کے دل پر کچھ زیادہ ہی چوٹ کی تھی، کیوں کہ اس میں کھلم کھلا ان کی تیزی کو للکارا گیا تھا۔

''لو بھلا اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ تم میرے دوست ہو، تمہیں بہتر مشورہ دینا تو میرا فرض بنتا ہے۔ نئی سائیکل کے مقابلے میں پرانی سائیکل کے بہت سے فوائد ہیں۔

ایک تو یہ کہ سستی مل جاتی ہے۔ تھوڑے سے روپوں میں آدمی پوری سائیکل کا مالک کہلواتا ہے۔ کوئی اس کو عاریتاً مانگنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مانگ کر لے بھی جاتا ہے تو گردشِ ایام کا ستایا ہوا کوئی نہ کوئی پرزہ اس کے ہاتھوں ٹوٹ جاتا ہے، جسے وہ خود ہی ٹھیک کروا دیتا ہے یا اس کی جگہ نیا پرزہ لگوا دیتا ہے۔ چوری چکاری کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ لاک کرنے کی فکر سے چھٹکارہ مل جاتا ہے۔ اگر کہیں راستے میں ٹائر پنکچر ہو جائے اور قریب میں کوئی پنکچر کی دکان نہ ہو تو نہایت اطمینان سے فٹ پاتھ کے کنارے بغیر لاک کیے، ڈال کر سکون سے گھر چلے آؤ۔

میرا ایک جاننے والا کباڑیہ ہے۔ میں تمہیں اس کا پتا دے دیتا ہوں۔ بنکو کباڑیہ اس کا نام ہے۔ کل صبح جا کر اس سے مل لو۔ امید ہے وہ تمہارے لیے پرانی سائیکل کا انتظام کر دے گا۔'' گلو میاں بولے۔

''واہ بھئی واہ...... گلو میاں تم نے تو کمال کر دیا۔ سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔'' چچا تیز گام خوش ہو کر بولے دوسرے دن وہ جمن کو لے کر گلو میاں کے بتائے ہوئے پتے پر موجود تھے۔

''ہوں...... تو تمہیں ایک عدد پرانی سائیکل چاہیے؟'' بنکو کباڑیہ سر سے لے کر پاؤں تک چچا تیز گام کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں...... سائیکل جتنی بھی پرانی ہو ہمیں منظور ہے۔'' چچا تیز گام زور زور سے سر ہلاتے ہوئے بولے، جس سے ان کی ٹوپی کا پھندنا بھی ہلنے لگا۔

''ایک ہے تو سہی...... میرے دادا جان چلایا کرتے تھے...... آہ...... وہ بھی کیا زمانہ تھا جب میرے دادا جان بڑے ذوق وشوق سے تیار ہو کر اپنی سائیکل پر سوار ہو کر نواب فخر الدین فخری کے دربار میں جایا کرتے تھے۔'' بنکو کباڑیہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

''کیا......؟'' چچا تیز گام چلا اٹھے۔ ''ارے...... ہم اسی نواب فخر الدین فخری کے بیٹے ہی تو ہیں۔ چچ...... چچا...... اوہ میرا مطلب ہے نواب تنویر احمد۔'' چچا تیز گام اکڑ کر بولے۔

''کیا......؟'' اب حیران ہونے کی باری بنکو کباڑیے کی تھی۔

''مائی باپ...... یہ ساری دُکان ہی آپ کی ہے...... جو من چاہے اس میں سے لے جاؤ۔'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''نہیں! اس وقت ہمیں صرف ایک عدد سائیکل چاہیے...... اور وہ بھی پرانی۔'' چچا تیز گام بولے۔ ''بتاؤ کتنے روپے لو گے؟''

''حضور......! آپ سے کیا لینا دینا، ہم تو آپ کے خادم ہیں۔ آپ گھر تشریف لے جایئے۔ ملازم سائیکل آپ کے گھر پہنچا آئے گا۔'' بنکو کباڑیہ تو چچا تیز گام کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔

''نہیں...... قیمت تو ہم ضرور ادا کریں گے۔ جمن! ان کو 9 ہزار روپے دے دو......'' چچا تیز گام نے بارعب لہجے میں جمن کو حکم دیا۔

''کک...... کیا...... مالک! نن...... نو...... ہزار۔'' جمن نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... ہاں...... ہم نے نو ہزار ہی کہا ہے۔ نوے ہزار نہیں کہا۔''

چچا تیز گام جمن کو گھورتے ہوئے بولے۔ جمن نے بے بسی سے کندھے اُچکائے اور بنکو کباڑیے کو تھما دیے جو اس نے کچھ دیر کی نہ نہ کے بعد لے ہی لیے۔ چچا تیز گام جمن کے ساتھ گھر چلے آئے۔

وہ ظہر کی نماز پڑھ کر گھر آئے۔ ابھی دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ استاد نے آ کر اطلاع دی کہ بنکو کباڑیے کا ملازم سائیکل دروازے پر چھوڑ گیا ہے۔

''تم دونوں جا کر سائیکل صاف کرو...... ہم ابھی آتے ہیں۔'' چچا تیز گام بولے۔ کچھ دیر بعد چچا تیز گام باہر نکلے تو ایک عجیب وغریب سی مشینری ان کے سامنے تھی جس کو اور سب کچھ تو کہا جا سکتا تھا لیکن سائیکل نہیں۔

''اب ذرا دھیان سے پکڑنا...... اگر اب کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' چچا تیز گام کھا جانے والی نظروں سے جمن اور استاد کو گھورتے ہوئے بولے۔

''ٹھ...... ٹھیک ہے...... مم...... مالک! لل...... لیکن......'' جمن ہکلاتے ہوئے بولا۔

''کیا لیکن......؟'' چچا تیز گام نے آنکھیں نکالیں۔

''وہ...... وہ...... میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ چوں کہ آپ کو سائیکل چلانی نہیں آتی، اس لیے آپ سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر کے پہلے پیڈل مارنا سیکھیں۔ آپ کو پیڈل مارنا آ گئے تو آپ سائیکل بھی سیکھ جائیں گے۔'' جمن ڈرتے ڈرتے بولا۔

''واہ...... بھئی واہ...... بہت خوب۔ جمن! ہم تو تمھیں نرا بدھو سمجھتے تھے۔''

''ہاں...... ہاں...... یہ ہماری صحبت کا اثر ہے کہ تمہارے بھوسے بھرے دماغ میں بھی کچھ عقل آئی۔ ٹھیک ہے، اسے اسٹینڈ پر کھڑی کرو۔'' چچا تیز گام جمن کو سراہتے ہوئے بولے۔ جمن کی ترکیب ان کے دل کو لگی تھی۔ جمن اور استاد نے مل کر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔

چچا تیز گام اچک کر سائیکل کی گدی پر یوں بیٹھے جیسے وہ سائیکل نہ ہو کوئی شہہ زور گھوڑا ہو اور لگے پیڈل مارنے۔ سائیکل چوں کہ اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی تھی، سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے جمن اور استاد سائیکل چھوڑ کر ایک طرف ہو گئے۔ کچھ دیر تو چچا تیز گام آہستہ آہستہ پیڈل مارتے رہے لیکن بھئی وہ بھی آخر اپنے نام کے تیز گام تھے۔ آہستگی بھلا ان کے مزاج میں کہاں تھی۔ لہٰذا کچھ ہی دیر بعد وہ یوں زور زور سے پیڈل مار رہے تھے جیسے کسی سائیکل ریس میں شامل ہوں۔

''مالک!'' چچا تیز گام کو جمن اور استاد کی مشترکہ آواز سنائی دی۔ وہ بھلا ان آوازوں کو کہاں خاطر میں لانے والے تھے، لہٰذا زور زور سے پیڈل مارتے رہے۔ ان کو یوں پیڈل مارنے میں بے حد مزہ آ رہا تھا کہ اچانک ان کو کسی گڑ بڑ کا احساس ہوا۔ اب جو انھوں نے غور سے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو مارے خوف و حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جب وہ سائیکل پر بیٹھے تھے تو ان کے دائیں بائیں کا منظر رکا ہوا تھا لیکن اس وقت یہ منظر تیزی سے پیچھے کو جا رہا تھا۔

اب سائیکل چل رہی تھی یا دائیں بائیں گلی میں موجود مکانات پیچھے کو دوڑ رہے تھے، چچا تیز گام حیرت سے سوچ رہے تھے۔ پھر اچانک جیسے ان کو ہوش آ گیا۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... اوہ...... میں مر گیا۔'' وہ زور زور سے چلاتے ہوئے بولے۔ یہ دیکھتے ہی کہ سائیکل چل رہی ہے اور وہ چلتی سائیکل پر بیٹھے ہوئے ہیں، مارے خوف ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسٹینڈ پر کھڑی سائیکل کب اسٹینڈ سے اتر کر چل پڑی انھیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔ بریک کا ان کو علم نہیں تھا۔

اس لیے وہ زور زور سے پیڈل پر پاؤں مارتے ہوئے اور پیڈل کو مضبوطی سے تھامے بس بچاؤ! بچاؤ! پکارے جا رہے تھے کہ اچانک چچا تیز گام کے پڑوسی گلاب خان گلی کے نکڑ پر نمودار ہوئے۔ گلاب خان نسوار کی ڈبیا کے ڈھکن پر لگے آئینے میں دیکھ کر نسوار کی چٹکی ڈاڑھ تلے دبانے میں مشغول دُنیا و مافیہا سے بے خبر چل رہے تھے۔ جب تک چچا تیز گام کی بچاؤ! بچاؤ! کی پکار سن کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوتے اور سنبھلتے، چچا تیز گام ایک زوردار دھماکے سے ان سے ٹکرا گئے۔ سائیکل چوں کہ بے حد تیزی میں تھی، اس لیے گلاب خان سائیکل کے مڈگارڈ پر ٹنگ کر رہ گئے اور سائیکل کسی سرکش گھوڑے کی طرح دوڑے جا رہی تھی کیوں کہ چچا تیز گام نے زور زور سے پیڈل مارنا بند نہیں کیا تھا۔ پیڈل مارنا تو وہ تب کرتے نا جب وہ چلانا بند کرتے...... پاؤں تو وہ دراصل چلاتے ہوئے مار رہے تھے جو خوش قسمتی بدقسمتی سے پیڈل پر لگ رہے تھے۔

کچھ دیر تو گلاب خان ہکا بکا رہے، جیسے ہی ان کو ہوش آیا وہ زور زور سے چلانے لگے۔ ''اوئی خانہ خراب کا بچی...... ہمارا نسوار...... اوئی خانہ خراب...... ہمارا نسوار کی ڈبیا۔''

گلاب خان صاحب زور زور سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ تب تک سائیکل گلی کے موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ یہاں سے دو گلیاں نکلتی تھیں۔ گلاب خان کے یوں زور زور سے ہاتھ پاؤں مارنے کی وجہ سے اچانک سائیکل ایک گلی میں مڑ گئی۔ اب جو چچا تیز گام نے سامنے دیکھا تو ان کی سٹی گم ہو گئی۔ گلی آگے سے بند تھی۔ سائیکل تیزی سے چلتی ہوئی ایک زوردار دھماکے سے دیوار سے ٹکرائی۔ چچا تیز گام کسی فٹ بال کی طرح دیوار سے ٹکرا کر مردہ چھپکلی کی طرح گرے، بے ہوش ہونے سے پہلے وہ بس اتنا دیکھ سکے کہ گلاب خان اپنے گھٹنوں کو پکڑ کر درد سے ناچ رہا تھا۔

''اوئی خانہ خراب کا بچی ہمیں مار دیا۔ ہمارا ٹانگ توڑ دیا۔''

ایک انار سو بیمار

زبیدہ سلطانہ

شہر میں موسمی بخار ایسا پھیلا کہ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں ایک دو مریض نہ ہوں۔ حکیم صاحب ہر کسی کو بخار کی دوا انار کے عرق میں حل کر کے پلانے کی تاکید کرتے۔ قاضی جی کا بیٹا بیمار ہوا تو انہیں بھی حکیم صاحب نے جو دوا دی، وہ انار کے عرق میں دینے کو کہا۔

قاضی جی محلے کے پھل فروش کی دُکان پر گئے اور انار مانگا۔ اُسی وقت مولوی صاحب بھی انار تلاش کرتے ہوئے اُسی دُکان پر آئے۔ اب مشکل یہ درپیش تھی کہ انار کا موسم ختم ہو چکا تھا مگر دُکان دار کے پاس صرف ایک انار کئی دن کا پڑا ہوا تھا۔ اب اکٹھے دو گاہک آگئے اور دونوں ہی محلے دار تھے، کس کو انار دیتا اور کس کو انکار کرتا؟ اس نے دونوں سے کہہ دیا کہ انار نہیں ہے۔ اسی طرح شام تک کئی گاہک انار لینے آئے مگر پھل فروش نے کسی کو وہ ایک انار نہ دیا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ باقی لوگوں کو پتا چلا تو وہ شکایت کریں گے۔

پھل فروش عصر کی نماز پڑھنے گیا تو نماز کے بعد قاضی صاحب کے بچے کی صحت کے لیے دعا ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ بچہ بہت بیمار ہے۔ یہ سن کر وہ دُکان پر آیا اور "اکلوتا" انار چھپا کر قاضی صاحب کے گھر دینے گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ تم نے صبح ہی میرے پوچھنے پر کیوں نہ دے دیا؟ تو پھل فروش نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے معذرت کی اور کہنے لگا:

"سو سے زیادہ گاہک انار کا پوچھتے ہوئے آئے، آخر یہ ایک انار میں کس کو دیتا کس کو نہ دیتا؟ پھر آپ جب آئے تو آپ کے ساتھ ہی مولوی صاحب تھے، میں نے انکار ہی میں عافیت سمجھی، اب بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہے، یہ سن کر انار لے آیا ہوں، اللہ پاک اسے صحت دے اور باقی سب بیماروں کو بھی شفا دے، آپ خفا نہ ہونا میری مجبوری تھی کہ سو بیمار تھے اور ایک ہی انار تھا۔"

انار سے بچے کو شفا ہوئی یا نہ ہوئی، یہ الگ بات ہے مگر اس واقعہ سے یہ ضرب المثل ضرور واضح ہوگئی کہ جب کبھی ضرورت مند زیادہ ہوں اور چیز کم ہو تو فوراً یہی بات زبان پر آ جاتی ہے کہ ایک انار سو بیمار۔

1- آؤ بھائی بازار جائیں
ایک شیشی میں دو رنگ لائیں

2- سامنے آئے، کر دے دو
مارا جائے نہ زخمی ہو

3- ایک آئی گوروں کی فوج
خاک میں دیکھو ان کی موج
صورت ان کی جیسے انڈہ
ہاتھ لگاؤ تو وہ ٹھنڈا

4- سفید مرغی ہری پونچھ
تجھ کو نہ آئے تو خالہ سے پوچھ

5- سرخ کوٹھڑی ہرے کواڑ
لونگوں کا گچھا پانی کی بہار

6- دن کو جلے رات کو بجھے
آندھی سے ڈرے بادل سے چھپے

موقع ملتے ہی پھر آ ڈٹے
کہو جی بچو! کیا سمجھے؟

7- کاغذ کا اِک یار ہمارا
سب بچوں کا راج دُلارا
ت ہے پہلے ت ہے آخر
سب کا دوست سب کا پیارا

8- دن کو سوئے رات کو روئے
جتنا روئے اتنا کھوئے

9- گاگر میری جل بھری سر پر لادی آگ
جب بجائی بنسری تو نکلا کالا ناگ

10- چھوٹی سی بٹیا
گز بھر کی چٹیا

11- باہر سے آئے دو ملنگ
سبز ٹوپیاں نیلے رنگ

12- ایک میدان کی پانچ سڑکیں
کوئی بڑی کوئی چھوٹی

جوابات: 1۔انڈا 2۔آئینہ 3۔ژالہ (اولے) 4۔مولی 5۔تربوز 6۔سورج 7۔رسالہ تعلیم و تربیت 8۔موم بتی 9۔حقہ 10۔سوئی 11۔بینگن 12۔ہاتھ کی انگلیاں۔

باجی رشیدہ کا ایک کانٹا گم ہوگیا ہے۔ اگر آپ ڈھونڈ سکیں تو آپ کو لے لینے کی اجازت ہے۔

نقطے ملائیے

- لفظ پاکستان کا سب سے پہلے جنوری 1933ء میں استعمال ہوا۔
- پاکستان میں پہلی مردم شماری 1951ء میں ہوئی۔
- کے۔ٹو کی بلندی کی پیمائش کرنل منٹگمری نے کی تھی۔
- ''آفت چین'' چین کے دریائے ہوانگ کو کہا جاتا ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ 196 آتش فشاں پہاڑ جاپان میں ہیں۔
- حضرت امام بری شاہ لطیفؒ کا شجرہ نسب حضرت امام موسیٰؒ سے جاملتا ہے۔

(شمیم اختر، لاہور)

- خلا بازوں کا لباس شیشے کے دھاگوں اور ریشوں سے بنایا جاتا ہے۔
- سورج گرہن کے وقت اس کے گرد نظر آنے والا چمکیلا حلقہ کورونا کہلاتا ہے۔
- روسی زبان میں خلا باز کو کاسمونات کہا جاتا ہے۔
- سب سے پہلے کتے کو خلائی سیارے کے ذریعے خلا میں بھیجا گیا۔
- خلا میں بھیجے جانے والے کتے کا نام لائیکا تھا۔
- سیارہ چاند کسی بھی قسم کی گیس سے پاک ہے۔
- سیٹلائٹ (Satelite) یونانی زبان کا لفظ ہے۔
- لفظ سیٹلائٹ کے معنی ساتھی ہیں۔

(روحی بانو، ملتان)

- سکوتِ صبح کی سرزمین مشرق کے ملک کوریا کو کہا جاتا ہے۔
- یورپ کا مرد بیمار ترکی کو کہا جاتا ہے۔
- بحرالکاہل کی کنجی ایشیا کے ملک سنگاپور کو کہا جاتا ہے۔
- ایشیا میں جمہوریت کی نمائشی کھڑکی سنگاپور کو کہا جاتا ہے۔
- براعظم افریقا کے ملک ایتھوپیا کو صحرا کا چمن کہا جاتا ہے۔
- کھیلوں کا بانی یونان کو کہا جاتا ہے۔

(رانا اصغر، کراچی)

- نبیؐ کی دعائے علم سورۃ طٰہٰ میں ہے۔
- پارہ نمبر 19، سورۃ النمل کی آیت 31,30 کو آیت سلیمانی کہا جاتا ہے۔
- اصحابِ کہف کے چرواہے کا نام مرطونس تھا۔
- سورۃ البروج کی آیت نمبر 11 آیت حمصیہ کہلاتی ہے۔
- سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر 45 میں نبیؐ کو شاہد کہا گیا ہے۔
- قرآن پاک میں چار مسجدوں کا ذکر آیا ہے۔

(بشریٰ انصاری، گجرات)

- گردن سے اوپر کے جسمانی حصے میں کل 7 سوراخ ہوتے ہیں۔
- چہرہ کو بنانے کے لیے 14 ہڈیاں حصہ لیتی ہیں۔
- انسانی سر کا وزن 10 تا 12 پونڈ ہوتا ہے۔
- انسانی جسم میں پسلیوں کی تعداد 24 ہوتی ہے۔
- تبت کے لوگ اپنے جسم کے حصے زبان سے سلام کرتے ہیں۔

(کامران اکمل، جہلم)

- سکے عام طور پر کانسی کی دھات سے بنائے جاتے ہیں۔
- ویزلین اور موم، پٹرولیم کی کشید سے حاصل کیے جاتے ہیں۔
- دریاؤں پر بند باندھنے کو سول انجینئرنگ کہتے ہیں۔
- بوعلی سینا ''شیخ الرئیس'' اور ''العلم الثانی'' کے لقب سے مشہور تھے۔
- سترھویں صدی میں ابوبکر محمد زکریا رازی کو طب کا امام کہا جاتا ہے۔
- ابن الہیثم کا زیادہ سائنسی کام روشنی و شعاعوں کے متعلق ہے۔
- جالینوس کی تصنیف تشریحی اسباق پندرہ سو سال تک طب کی اساس اور حکم آخر تسلیم کی جاتی رہی ہیں۔
- ابن طبریٰ کی تصنیف فردوس الحکمت ہندی اور یونانی طب میں انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔
- گندھک اور شورے کا تیزاب جابر بن حیان نے ایجاد کیا۔
- جابر بن حیان کو بابائے کیمیا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔
- عظیم مسلمان سائنس دان عمر خیام کو یورپ میں فلسفے اور ہیئت کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

(عمران بشیر، خانیوال)

- فٹ بال کھیل کی ابتداء 500 قبل مسیح چین میں ہوئی۔
- ہوا بھری ہوئی فٹ بال کا وزن 14 اونس ہوتا ہے۔
- فٹ بال کے میدان کی وسعت 150x100 گز ہوتی ہے۔
- پاکستان فٹ بال فیڈریشن کا قیام 9 اپریل 1948ء میں عمل میں آیا۔

(عمیر احمد، راولپنڈی)

پانڈا

معصوم صورت، سیاہ بالوں سے سجا پانڈا (Panda) ایک میمل (Mammal) ہے جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام ایلوروپوڈا میلانولیکا "Ailuropoda

Melanoleuca" ہے۔ یہ جانور چین کا مقامی ہے جس کا شمار کم یاب انواع (Endangered Species) میں ہوتا ہے جو دنیا سے ناپید ہونے کا امکان رکھتی ہیں۔ ایک بڑے پانڈے کی جسامت 1.2 سے 1.8 میٹر ہوتی ہے۔ ان کی دُم 13 سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا پانڈا 160 کلوگرام جب کہ مادہ 75 سے 125 کلوگرام وزن کی ہوتی ہے۔ ننھے منے بچے کو "CUB" کہا جاتا ہے۔ نومولود "Cub" 15 سے 17 سینٹی میٹر کا ہوتا ہے جب کہ اس کا وزن 90 سے 130 گرام ہوتا ہے۔ ایک بالغ پانڈا روزانہ 9 سے 14 کلوگرام بانس کے پتے کھاتا ہے جب کہ "Cub" 6 سے 14 مرتبہ خوراک لیتا ہے جو ماں اپنا دودھ پلا کر مہیا کرتی ہے۔ پانڈا چین کا قومی جانور اور متعدد کمپنیوں کا نشان بھی ہے۔ چین میں منعقدہ اولمپکس کھیل میں پانڈا کو بطور Mascots دکھایا گیا تھا۔ چین، جاپان اور امریکہ میں پانڈا کو معدومی سے بچانے کے لیے تحقیقات جاری ہیں۔

شوٹنگ

رائفل، پستول، ائرگن، شاٹ گن وغیرہ کی مدد سے نشانہ بازی کا مقابلہ شوٹنگ (Shooting) کہلاتا ہے۔ اس کھیل کا باضابطہ آغاز برطانیہ میں 1860ء سے ہوا جب نیشنل رائفل ایسوی ایشن (NRA) قائم ہوئی۔ 1871ء سے مقابلہ جات کا آغاز امریکہ سے ہوا۔ 1896ء کے اولمپکس میں اس کے 5 مختلف مقابلہ جات منعقد ہوئے۔ اسی لیے 1897ء میں انٹرنیشنل شوٹنگ سپورٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کھیل میں کھڑے یا بیٹھ کر 200, 300 یا 600 یارڈز (Yards) پر ہدف کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک کھلاڑی 300 میٹر فاصلے پر 10 مرتبہ ٹارگٹ شوٹنگ
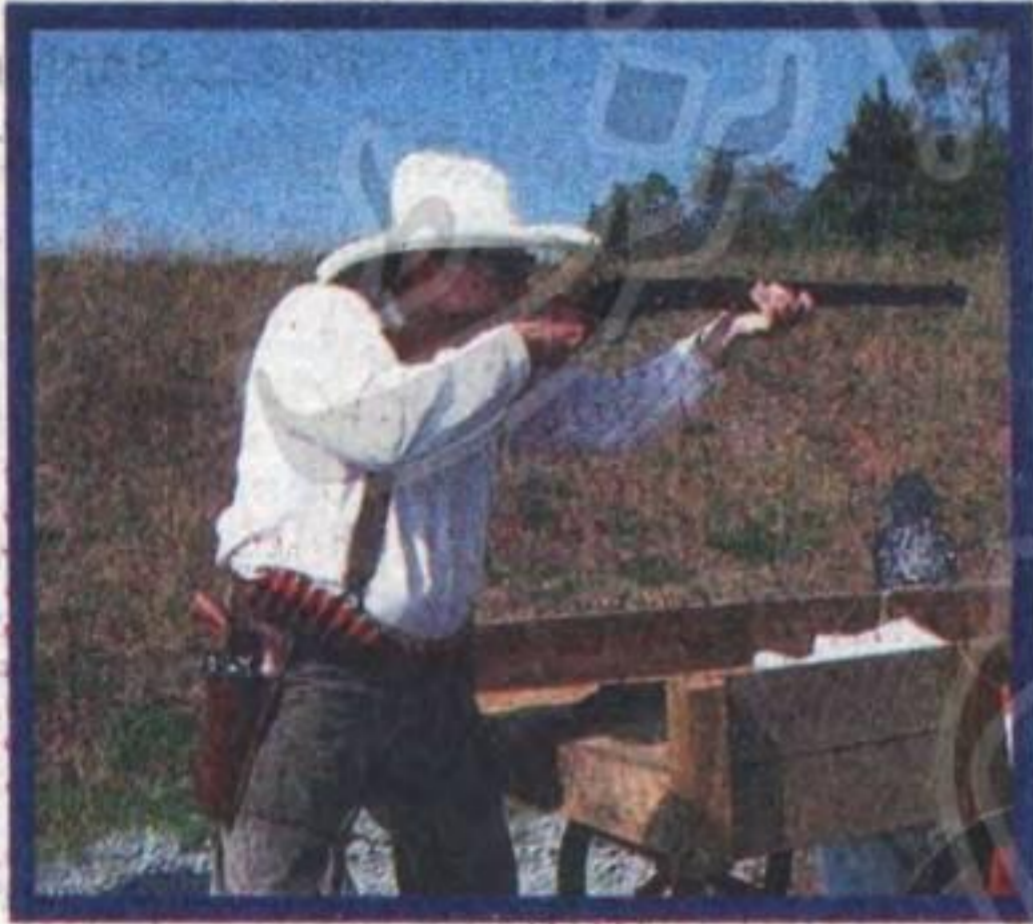
کرتا ہے جس کی روشنی میں فاتح کا فیصلہ ہوتا ہے۔ 1897ء میں پہلی بار سوئٹزرلینڈ چیمپئن بنا تھا۔ 2010ء میں چین شوٹنگ کا عالمی چیمپئن بنا۔ اگلا مقابلہ 2014ء میں ہونا ہے۔ پاکستان میں NRA کا قیام 1986ء میں ہوا۔ پاکستان نے کامن ویلتھ، ساؤتھ ایشین گیمز میں متعدد بار انعامات جیتے ہیں۔

تھرمومیٹر

تھرمومیٹر (Thermometer) کسی جسم کا ٹمپریچر یا درجۂ حرارت ماپنے کا آلہ ہے۔ یہ آلہ متعدد افراد نے مختلف اوقات میں ایجاد کیا۔ البتہ انسانی درجۂ حرارت ماپنے والا تھرمومیٹر سب سے پہلے Thomas C. Allburt نے 1866ء میں ایجاد کیا۔

تاہم اس سے قبل گلیلیو (Galileo) نے 1593ء اور Santorio نے 1612ء میں پانی کی مدد سے درجۂ حرارت کی پیمائش کی۔ الکوحل وغیرہ پر مشتمل تھرمومیٹر بھی ایجاد ہوئے، تاہم موجودہ تھرمومیٹر میں پارہ (Mercury) استعمال ہوتا ہے جو درجۂ حرارت کی پیمائش کا بہترین مصرف ثابت ہوا ہے۔ درجۂ حرارت کی پیمائش کے لیے 1714ء میں مرکری تھرمومیٹر کی ایجاد کے بعد 1724ء میں تھرمومیٹر کی نلی پر اعداد (Numaric) کندہ کر دیے گئے تاکہ پیمائش آسان ہو جائے۔ جرمن Daniel Gabriel نے فارن ہائیٹ جب کہ 1742ء میں Anders Celsius نے سینٹی گریڈ کا پیمانہ متعارف کرایا۔ اب انفرا ریڈ، ائرکرافٹ، ریکارڈنگ تھرمومیٹر، محکمہ موسمیات، محکمہ ماحول وغیرہ کے تھرمومیٹر بھی موجود ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا تھرمومیٹر کیلی فورنیا امریکہ کے علاقے Baker میں نصب ہے جو 1991ء میں Willis Herrow نامی شخص نے تعمیر کروایا۔ اس کا وزن 76812 پاؤنڈ اور سائز 125 کیوبک یارڈ ہے۔ یہ 57 سینٹی گریڈ (134 فارن ہائیٹ) تک درجۂ حرارت بتاتا ہے۔ اس تھرمومیٹر کی اونچائی 134 فٹ ہے۔ جنوری 2013ء میں اسے فروخت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

چینی پرچم

ہمارے پڑوسی و دوست ملک چین کا قومی پرچم (Flag) پیپلز ری پبلک آف چائنہ کا جھنڈا کہلاتا ہے۔ یہ پرچم سرخ رنگ کا ہے جو

کمیونزم نظام حکومت کی علامت ہے۔ پرچم کے ایک کونے کی جانب (بائیں جانب) گولڈن رنگ کا بڑا سا ستارہ ہے جس کے سامنے 4 چھوٹے ستارے Semi Circle کی صورت موجود ہیں۔ اسلامی ستارے کی طرح پرچم پر بنے ستارے 5 کونوں پر مشتمل ہیں۔ یہ ستارے قوم کے متحد ہونے کی علامت ہیں۔ 5 ستاروں والے چینی پرچم کو بنانے کے لیے کئی افراد نے حصہ لیا، تاہم کمیٹی نے Zhejiang کے شہری Zeng Liansong کے ڈیزائن کی منظوری دے دی۔ Zeng کے تیار کردہ پرچم کو 27 ستمبر 1949ء کو پہلی بار قومی سطح پر متعارف کروایا گیا، جب کہ 28 ستمبر 1949ء سے اسے سرکاری اخبارات و دستاویزات کا حصہ بنا دیا گیا۔

سرگرمیاں

سائفن کیا ہے؟

اشیاء: دو گلاس، پانی، تقریباً اٹھارہ انچ لمبی ربڑ کی نلی۔

آپ ربڑ کی اٹھارہ انچ لمبی نلی کا ایک سرا نلکے کی ٹونٹی میں فٹ کر کے اور دوسرے سرے پر انگلی رکھ کر فوارہ بنا سکتے ہیں۔ پھر اسی نلی کا سائفن بھی بن سکتا ہے۔

دو گلاس پانی سے آدھے آدھے بھر لیجیے۔ اس کے بعد ربڑ کی نلی کے نچلے سرے پر انگلی رکھ کر اوپر کے سرے سے اس میں پانی بھر لیں۔ جب پانی بھر جائے تو اوپر کے سرے پر بھی انگلی رکھ لیں تاکہ پانی نکلنے نہ پائے۔

اب اس نلی کا ایک سرا ایک گلاس میں اور دوسرا سرا دوسرے گلاس میں ڈال دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ دونوں گلاسوں میں پانی کی سطح بالکل ایک سی ہے۔ اگر دونوں گلاسوں میں پانی کی سطح ایک سی نہیں ہوگی تو ایک گلاس کا پانی، ربڑ کی نلی کے ذریعے، دوسرے گلاس میں آتا رہے گا یہاں تک کہ دونوں کی سطح برابر ہو جائے گی۔

اگر آپ ایک گلاس اوپر اٹھائیں گے تو اوپر والے گلاس کا پانی نیچے والے گلاس میں آنا شروع ہو جائے گا لیکن جونہی آپ نیچے والے گلاس کو اوپر والے گلاس کے برابر لے آئیں گے تو پانی واپس پہلے والے گلاس میں جانا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ دونوں گلاسوں میں پانی کی سطح ایک سی ہو جائے گی۔

وجہ یہ ہے کہ ایک ہی قسم کی مائع میں، جن کی سطح بھی ایک دوسرے کے برابر ہو، دباؤ بھی ایک سا ہوتا ہے۔

شہر کے مختلف حصوں میں نلوں کے ذریعے پانی پہنچانے کے لیے بھی یہی سائفن کا اصول استعمال کیا جاتا ہے۔

لفافہ بنائیں

آپ کسی رنگین کاغذ یا گفٹ پیپر سے یہ خوب صورت لفافے بنا سکتے ہیں۔

◎ لفافے کے تمام کنارے کھول کر اسے ہموار کریں۔

◎ اب رنگین کاغذ کو الٹا بچھا کر اس لفافے کو اوپر رکھیں اور کناروں پر سکیل رکھ کر پنسل سے نشان لگائیں۔
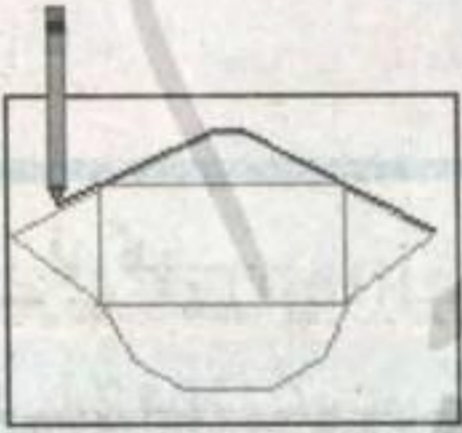
◎ احتیاط سے ان نشانات کو کاٹیں۔
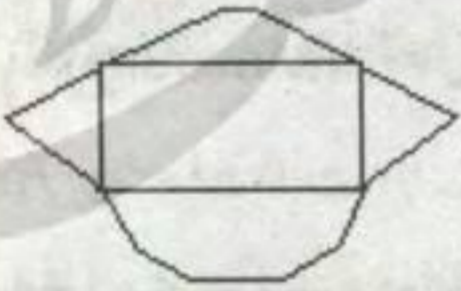
◎ اب اس لفافے کو اسی طرح موڑیں جیسے عام لفافہ ہوتا ہے۔ کناروں پر گوند لگا کر بند کر دیں۔

◎ آپ کا خوب صورت لفافہ تیار ہے۔

انعامی سلسلہ

سوال یہ ہے کہ......!

۱۔ انسانی جسم میں پسلیوں کی تعداد کتنی ہے؟
۲۔ پانڈا کے ننھے بچوں کو کیا کہا جاتا ہے؟
۳۔ ''اَلْبَاسِطُ'' کا کیا مطلب ہے؟
۴۔ کرنسی نوٹوں کی ابتداء سب سے پہلے کہاں ہوئی؟
۵۔ پاکستان میں پہلی مردم شماری کب ہوئی؟
۶۔ ولندیزی گھڑی ساز کا آٹھواں عجوبہ ''گھڑیال'' کہاں نصب ہے؟

درج بالا سوالوں کے جوابات مئی 2013ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجئے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

اپریل 2013ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:

1- اروی معطر بیگ، گجرات 2- محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو 3- اجالا یاسر، لاہور

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 رمئی 2013ء ہے۔

نام: ____________
شہر: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 رمئی 2013ء ہے۔

نام ________ مقام ________
میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ____________
موبائل نمبر: ____________

سوال یہ ہے کہ......!

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 رمئی 2013ء ہے۔

نام ________ عمر ________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 رمئی 2013ء ہے۔

نام: ____________
مقام: ____________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

جون کا موضوع ''فیصل مسجد'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 رمئی 2013ء ہے۔

نام ________ عمر ________
مکمل پتا: ____________
موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ________ شہر ________
مقاصد ____________
موبائل نمبر: ____________

کھوج لگایئے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

میڈم عظمیٰ ساتویں جماعت کے بچوں کو پڑھاتی ہیں۔ آج وہ کمرۂ جماعت میں بڑے اچھے موڈ میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے بچوں سے ہلکی پھلکی گپ شپ کی اور حال احوال پوچھنے کے بعد ایک بڑا سا چارٹ نکالا جس کے اوپر ایک تصویر بنی ہوئی تھی اور ساتھ میں یہ عبارت لکھی تھی۔

چیڑ کے درخت کے پاس شاہین مورت بنی بیٹھی تھی۔ پاس ہی نہر بہہ رہی تھی۔ پانی میں بلبلے اٹھ رہے تھے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی مرغوب کو پکارا اور کہا:

''لو! یہ بگل اٹھا کر اس لڑکے کو دے دو جو گدھا نہیں ہے۔''

مرغوب بولا: ''تم کو نجمہ پیاری ہے؟''

شاہین بولی: ''میری ننھی منھی گڑیا کو اللہ رکھے۔ تم باتیں نہ بنایا کرو۔ اپنی حرکت سے باز آؤ۔ دیکھو، ابا بیل لیے آ رہے ہیں۔ میں آج ابا سے تمہاری شکایت کروں گی۔''

میڈم عظمیٰ کی اس عبارت کے الفاظ میں کچھ پرندوں کے نام چھپے ہوئے ہیں۔ آپ غور سے کھوج لگائیں کہ یہ کون سے پرندوں کے نام ہیں۔
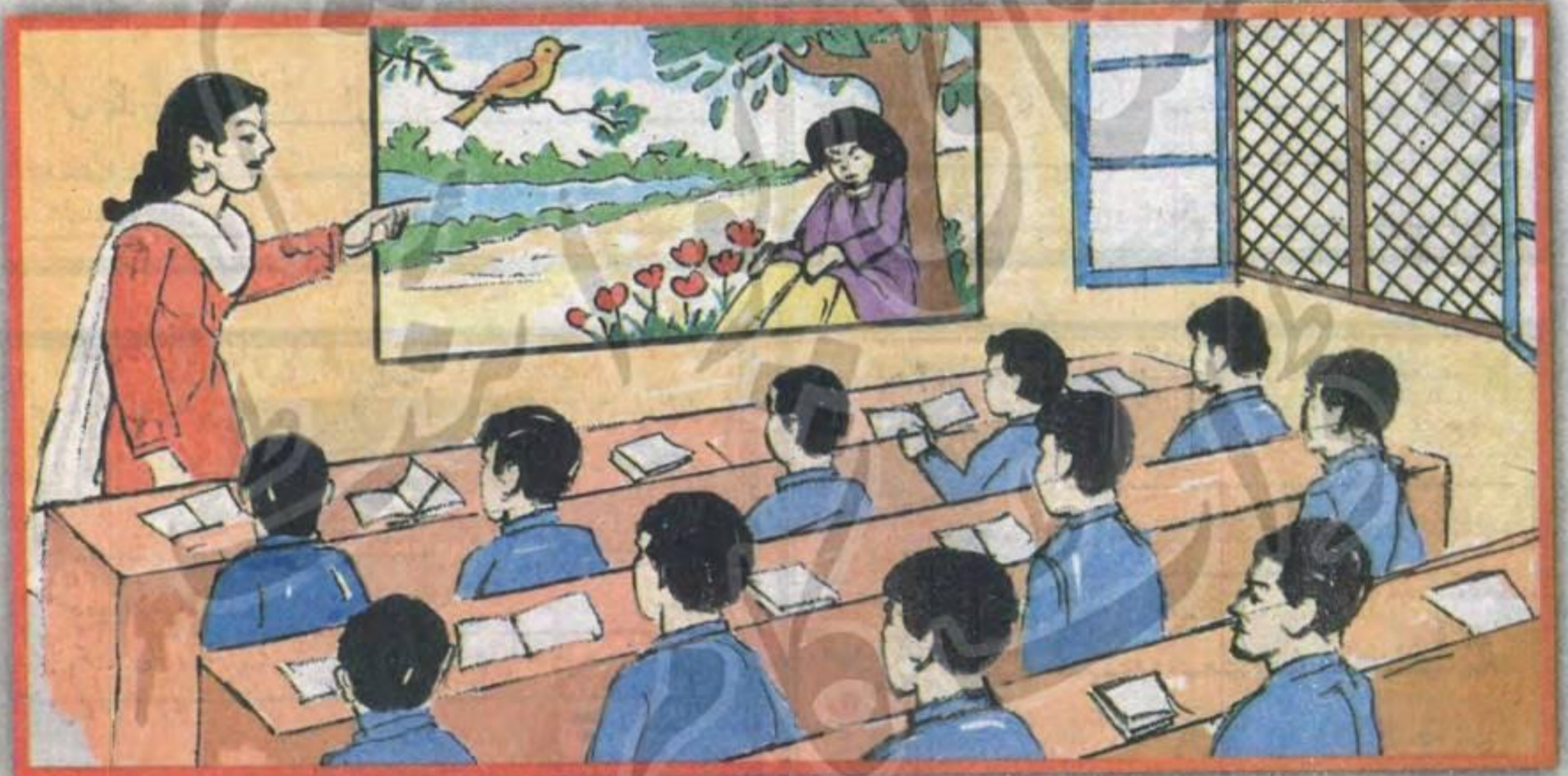
اپریل 2013ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگایئے'' کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے دونوں بیٹے کشتی پر جائیں گے، پھر ایک بیٹا وہاں دوسرے کنارے پر ٹھہر جائے گا۔ دوسرا کشتی واپس لے جائے گا، پھر بیٹا اتر جائے گا اور باپ بیٹھ کر دوسری طرف جائے گا۔ وہاں جو بیٹا کھڑا ہوگا، وہ کشتی واپس لے جائے گا اور دوسرا بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر آ جائے گا۔ یوں تینوں باپ بیٹے دریا کے دوسری طرف آ جائیں گے۔

درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں۔

1۔ عبیداللہ احمد عباسی، پشاور
2۔ مآب زینت، جہلم کینٹ
3۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم
4۔ نائمہ تحریم، کراچی
5۔ جویریہ نثار، آزاد کشمیر

میری زندگی کے مقاصد

وقار احمد، اوتھل
میں استاد بن کر علم کی روشنی گھر گھر پہنچاؤں گا۔

منیر سرور، شیخوپورہ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد اکبر، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر خدمت خلق کروں گا۔

شاہ بہرام انصاری، ملتان
میں اپنے قلم کے ذریعے لوگوں اور معاشرے کی اصلاح کروں گا۔

حمنہ اظہر، سرگودھا
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کر کے اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

میاں احمد بن وقاص، ملتان
میں پڑھ لکھ کر والدین اور قوم کی خدمت کروں گا۔

سحر احمد، گوجرانوالہ
میں غریبوں اور یتیموں کی فلاح کے لیے کام کروں گی۔

حافظ توصیف الرحمان، ننکانہ صاحب
میں فوجی بن کر ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

ایمن سلیم، گوجرانوالہ
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین اور ملک کا نام روشن کروں گی۔

اسامہ احمد، گجرات
میں الیکٹرونکس میں مہارت حاصل کر کے پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

حسن علی، سیال کوٹ
میں پڑھ لکھ کر اچھا انسان بنوں گا اور اچھے اچھے کام کروں گا۔

مائرہ بتول، لاہور
میں استاد بن کر علم کی روشنی پھیلاؤں گی۔

لاریب ہاشمی، فیصل آباد
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

حافظ محمد حماد، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا اور اچھا پاکستانی بنوں گا۔

حماد احمد، راول پنڈی
میں استاد بن کر قوم کی خدمت کروں گا۔

اسلیہ گل، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر بیماروں کا مفت علاج کروں گی۔

معاویہ صالح، رحیم یار خان
میں پائلٹ بن کر ائر فورس میں جاؤں گا اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

ملک ولید زیب، پشاور
میں اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کر کے اپنی زندگی قربان کرنا چاہتا ہوں۔

عرفان اللہ، اوتھل
میں عوام الناس کو علم کی روشنی سے آگاہ کروں گا۔

عشاء تنویر، سیال کوٹ
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

عبداللہ اظہر، راول پنڈی
میں ایک محب وطن پاکستانی اور ایک اچھا مسلمان بنوں گا اور فائر فائٹر بن کر لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کروں گا۔

نشاء رمضان، فیصل آباد
میں بڑی ہو کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

عظمیٰ شہزادی، گجرات
میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کر کے اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔

اسد بٹ، ملتان
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد عمر، راول پنڈی
میں حافظ قرآن اور عالم دین بن کر اسلام کی سربلندی کے لیے کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون آیا: ''ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے نے ریت کھالی ہے۔ میں نے اسے پانی پلا دیا ہے۔ اب بتائیں کیا کروں؟''
ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ''اب صرف یہ کیجیے کہ اسے سیمنٹ نہ کھانے دیں۔''
(قراۃ العین، لاہور)

چند موٹے آدمی ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو باہر سے ایک آدمی نے جھانک کر کہا۔ ''یہ ڈبہ صرف ہاتھیوں اور گینڈوں کے لیے ہے؟''
اندر بیٹھے آدمیوں نے کہا۔ ''تشریف لے آئیں۔ یہاں گدھوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت ہے۔''
(علشبہ کوثر، ملتان)

پہلا آدمی (دوسرے سے): ''آپ دن میں کتنی مرتبہ شیو بناتے ہیں؟''
دوسرا آدمی: ''یہی کوئی 40 مرتبہ۔''
پہلا آدمی: ''کیا آپ پاگل ہیں؟''
دوسرا آدمی: ''نہیں میں حجام ہوں۔'' (تنزیلہ چوہدری، ساہی وال)

ڈاکٹر مریض سے: ''آپ کو کیا تکلیف ہے؟''
مریض: ''صبح سو کر اٹھتا ہوں تو آدھ گھنٹے تک سر چکراتا رہتا ہے۔''
ڈاکٹر: ''کل سے آپ آدھ گھنٹہ بعد اٹھا کریں۔ سر نہیں چکرائے گا۔''
(صالح حق، میاں والی)

طفیل: ''سناؤ بھئی ضیاء، نتیجہ کیسا رہا؟''
ضیاء: ''میں تو پاس ہو گیا، تم سناؤ!''
طفیل: ''کیا سناؤں میرے نام کا تو پہلا حرف ہی اڑ گیا۔''
(عائشہ صدیقہ، فیصل آباد)

فوٹوگرافر: ''میڈم آپ تصویر بڑی بنوانا چاہتی ہیں یا چھوٹی۔''
خاتون: ''چھوٹی۔''
فوٹوگرافر: ''تو پھر اپنا منہ بند کیجیے۔'' (عظمیٰ شہزادی، گجرات)

استاد: (شاگرد سے) ''تم اگر مغرب کی طرف چلتے رہو تو کہاں پہنچو گے؟''
شاگرد: ''جناب میں غروب ہو جاؤں گا۔'' (صفیہ ندیم، واہ کینٹ)

عورت: ''ڈاکٹر صاحب! نجانے میری بچی کو کیا ہو گیا ہے۔ آنکھیں گھوم گئی ہیں، چہرہ عجیب طریقے سے کھنچ گیا ہے۔''
ڈاکٹر: ''محترمہ! بچی کو کچھ نہیں ہوا لیکن براہِ کرم اس کی پونی ٹیل ذرا ڈھیلی کر دیں۔''
(رقیہ ناز، کراچی)

ایک صاحب غصے کے عالم میں پولیس اسٹیشن پہنچے اور ایک مردہ بلی محرر کے سامنے رکھتے ہوئے بولے: ''یہ کسی نے آج صبح میرے گھر میں پھینکی ہے۔''
محرر سر کھجاتے ہوئے بولا: ''قانون کی رو سے اگر چھ ماہ تک اس کا کوئی دعویدار نہ آیا تو آپ اسے رکھ سکتے ہیں۔'' (بلال احمد، گوجرانوالہ)

ایک سائیکل سوار کسی محلے سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک بچہ سائیکل کی زد میں آ گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ سائیکل سوار نے اسے جلدی سے بیس روپے دیے اور اسے چپ کروانے لگا۔ بچہ فوراً چپ ہو گیا اور بولا: ''انکل آپ پھر کب آئیں گے؟؟؟؟''
(نثار احمد، بورے والا)

باپ اپنے بیٹے سے: ''یہ کیا ہے؟ تمہارے ٹیسٹ میں 0 نمبر ہیں؟''
بیٹا: ''نہیں، ابو ٹیچر کے پاس اسٹار ختم ہو گئے تھے تو انہوں نے سیارے دینے شروع کر دیے۔''
(طلحہ نیازی، کوہاٹ)

☆☆☆

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن پاک کا موجودہ لب ولہجہ کیا کہلاتا ہے؟

i۔ مصری لب ولہجہ ii۔ قریشی لب ولہجہ iii۔ یمنی لب ولہجہ

2۔ حضرت محمد ﷺ کی قبر مبارک کس صحابیؓ نے کھودی؟

i۔ حضرت سلمان فارسیؓ ii۔ حضرت ابو طلحہؓ iii۔ حضرت عثمانؓ

3۔ قرآن پاک میں حضرت ہودؑ اور قوم عاد کا مسکن کس سرزمین کو کہا گیا ہے؟

i۔ فلسطین ii۔ احقاف iii۔ یمن

4۔ کلمہ طیبہ کے پڑھنے کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ الصلوٰۃ ii۔ تہلیل iii۔ تکبیر

5۔ کس نماز میں قرآن کی تلاوت نہیں کی جاتی؟

i۔ نماز چاشت ii۔ کوئی نماز نہیں iii۔ نمازِ کسوف

6۔ ''چیونٹی نامہ'' کس شاعر کی تصنیف ہے؟

i۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ii۔ حفیظ جالندھری iii۔ اسماعیل میرٹھی

7۔ لفظ پاکستان کے خالق چوہدری رحمت علی کہاں مدفون ہیں؟

i۔ میانی صاحب ii۔ کیمبرج یونی ورسٹی، انگلینڈ iii۔ جنت البقیع، مدینہ

8۔ کسی بھی چیز کا آکسیجن سے ملاپ کیا کہلاتا ہے؟

i۔ عمل تکسید ii۔ عمل انہضام iii۔ عمل تنفس

9۔ یورپ کے اس ملک کا نام بتائیے جس کی شکل جوتے سے ملتی جلتی ہے۔

i۔ مالٹا ii۔ اٹلی iii۔ ہنگری

10۔ کرکٹ کی اصطلاح میں کتنے رنز پر آؤٹ ہونے والے کھلاڑی کو ''ڈک'' کہا جاتا ہے؟

i۔ ایک رن پر ii۔ صفر رن iii۔ ننانوے رن

جوابات علمی آزمائش اپریل 2013ء

1۔ ارسطو 2۔ کولتار سے 3۔ مدینۃ النبی 4۔ لوہا
5۔ چودہ 6۔ چار 7۔ قربانی کرنا 8۔ گھنٹی کی آواز
9۔ بانگِ درا 10۔ عمرو بن العاص

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد محسن علی قادری، کامونکی (150 روپے کی کتب)
☆ کاظم حسین جمالی، کوئٹہ (100 روپے کی کتب)
☆ فائقہ شکیل، لاہور (90 روپے کی کتب)

''دماغ لڑاؤ'' سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
مرزا ہادی بیگ، حیدر آباد۔ محمد شہریار، شاہ کوٹ۔ طلحہ اعجاز، صوابی۔ فرح اسلام، اٹک۔ ثناء جمال، اسلام آباد۔ قاریہ میمونہ ابرار، کمالیہ۔ عائشہ افضل، شیخوپورہ۔ خدیجہ نشان، کامونکی۔ سید حسین حیدر، کھوٹہ۔ سیف اللہ، قصور۔ جویریہ ریاض، اسلام آباد۔ آصفہ عطاریہ، شکرگڑھ۔ عیشہ افضل، باسی والا۔ محمد زبیر عبداللہ، خانقاہ ڈوگراں۔ فرحت ندیم، سیال کوٹ۔ حمنہ امتیاز، سرگودھا۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ عبداللہ ارشد، باسی والا۔ عتیقہ ارشد، گوجرانوالہ۔ ربیعہ اقبال، کراچی۔ محمد حذیفہ انوار، جھنگ صدر۔ حارث زمان، ضلع کرک۔ سید طیب ترمذی، کراچی۔ حلیمہ نشان، کامونکی۔ نعمان علی، لاہور۔ محمد ذیشان اکرم قادری، کامونکی۔ محمد حامد رضا قادری، کامونکی۔ اریبہ مبشر، وزیر آباد۔ عشاء جنت احمد، ملتان۔ محمد عتیق الرحمٰن اسلم، میرپور آزاد کشمیر۔ محمد فریاد علی قادری، کامونکی۔ محمد توقیر جمیل، شکرگڑھ۔ محمد انیق اسد، اسلام آباد۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ محمد اسداللہ گل، راول پنڈی۔ عبیداللہ احمد عباسی، پشاور۔ امجد جاوید، راول پنڈی۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ علینہ اظہر، اسلام آباد۔ سمیعہ انور خٹک، لاہور۔ فارعہ فہیم، لاہور۔ سارہ طارق، فیصل آباد۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ زارا گل، کندیاں۔ جویریہ ذوالفقار، لاہور۔ حسن علی عتیق، لاہور۔ محمد وقار علی، خوشاب۔ حمنہ اظہر، سرگودھا۔ اقراء فاروق، گوجرانوالہ۔ محمد آصف، ملتان۔ خورشید علی، کراچی۔

آئیے عہد کریں!

سلمان ریزرویشن آفس ریلوے ہیڈ کوارٹر میں اپنی خالہ جان کے لیے ٹکٹ لینے کے لیے گیا جنھوں نے اپنے بچوں کے ساتھ کچھ دنوں بعد کراچی جانا تھا۔ سلمان نے دیکھا کہ وہاں کاؤنٹر پر لائنیں لگی ہیں اور لوگ قطار بنا کر اپنی باری پر ٹکٹ لے رہے ہیں۔ سلمان نے تھوڑی دیر جائزہ لینے کے بعد موقع پا کر بغیر قطار میں لگے جلدی سے ٹکٹ لے لیا، حالانکہ وہاں کئی لوگوں نے اسے بغیر قطار کے ٹکٹ لینے سے منع بھی کیا۔

اتفاق سے حسن صاحب جو کہ محلّہ کی ویلفیئر سوسائٹی کے چیئرمین تھے اور سلمان کو بھی جانتے تھے، انہوں نے سلمان کو ایک طرف کیا اور اسے دیوار پر لگے ایک چارٹ کی طرف اشارہ کیا جس پر لکھا تھا: ''قطار بنانا چیونٹیوں سے سیکھیں۔''

حسن صاحب نے اسے بتایا کہ مہذب معاشرے میں اصول، قاعدہ اور نظم و ضبط ہوتا ہے جس سے نظام میں آسانی، درستگی اور ترتیب رہتی ہے۔ آپ کی طرح ہر فرد آسانی اور سہولت چاہتا ہے لیکن بے قاعدگی اور بے اصولی سے نہیں۔ آپ اس چارٹ کو دیکھیں جس پر چیونٹیاں قطار بنا کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ مہذب لوگ ان اصولوں کی پابندی کرتے ہیں جس سے معاشرہ فلاح پاتا ہے۔

پیارے بچو! آپ بھی اس بات کا عہد کریں کہ کسی بھی جگہ قطار بنا کر اپنی باری پر مطلوبہ مقصد حاصل کریں گے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں، ان کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہدنامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔

شاباش ان بچوں نے عہد کیا ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے اپنی یا دوسروں کی جان و مال کا نقصان ہو اور قانون کی خلاف ورزی ہو۔

عبداللہ طارق، بہاولنگر۔ محمد عمر عطاء قادری، کامونکی۔ عنبر سیف، اسلام آباد۔ نور فاطمہ، کامونکی۔ اسد اللہ گل، راول پنڈی۔ نور العین اختر، راول پنڈی۔ سارہ طارق، فیصل آباد۔ زنیرہ شکیل، علی پور چٹھہ۔ حسن علی عتیق، لاہور۔ محمد ابوبکر علی، سرگودھا۔ محمد زوہیب، کراچی۔ عتیق الرحمان، گجرات۔ علینہ اظہر، اسلام آباد۔ اسماء زاہد، گوجرانوالہ۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ شہروز رمضان، فیصل آباد۔ شہرین صادق، گوجرانوالہ۔ کشف ارشد، باسی والہ۔ محمد حامد رضا قادری، کامونکی۔ سیدہ فبھا فاطمہ شیرازی، کوٹ مومن۔ شاہان حیدر، لاہور۔ روحان احمد، ملتان۔ سلمان حیدر، کہروڑ پکا۔ محمد واصف، بہاول پور۔ غلام محی الدین، سیال کوٹ۔ ایمن وسیم، بنوں۔ حنظلہ ساجد الرحمٰن، حویلی لکھا۔ محمد صہیب مبشر، لاہور۔ معاویہ صالح، رحیم یار خان۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ ایمن عتیق، راول پنڈی۔ فرحان احمد، گجرات۔ اسامہ شہروز، شیخوپورہ۔ وانیا نثار، لاہور۔ عبداللہ بن ثقلین، بہاولپور۔ محمد عمر فاروق، سیال کوٹ۔ زین العابدین، لاہور۔ محمد بلال، ملکہ ہانس۔ عظمت ندیم، سیال کوٹ۔ یوسف جمیل لغاری، میرپور آزاد کشمیر۔ صالحہ زعیم، ٹیکسلا۔ جویریہ شکیل، شکرد۔ عمار سلیم، اسلام آباد۔ محمد حسن خالد، سرگودھا۔ سمیع الرحمٰن، لاہور۔ محمد ذیشان، کوٹ چھٹہ۔ تابندہ نعیم، اسلام آباد۔ زائرہ زینب، ملتان۔ سیف اللہ، قصور۔

کی خدمت کا دائرہ بہت پھیل جاتا ہے اور اسے ہر کوئی جاننے لگتا ہے۔ مجھے یہ باتیں میڈم Ruth Pfau کے بارے میں کچھ جان کر پتا چلیں۔

میں چوں کہ ایم بی بی ایس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا تو کئی طرح کے طبی جریدے میرے زیر استعمال رہتے تھے۔ میں نے ایک میگزین میں جذام کے بارے میں پڑھا۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ پوری دنیا میں جذام کے سب سے زیادہ مریض بھارت میں پائے جاتے ہیں اور پاکستان نے جذام کی بیماری کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی، جسے عالمی برادری قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور

میرے بڑے بھائی لندن میں تھے۔ وہ وہاں ایک فلاحی ادارے میں بس چلاتے تھے اور وہاں کی مقامی زندگی میں اتنے رچ گئے تھے کہ جب سالوں بعد پاکستان آتے تو اجنبی سے لگتے تھے۔ انہیں لندن کے معاملات کی فکر ہوتی تھی کہ انگریز بچوں کو جن کے وہ ہر بار مختلف نام لیتے تھے، یاد کرتے رہتے تھے اور فون پر اپنے ساتھی ڈرائیور کو بچوں کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے اور خاصے بے چین نظر آتے۔

میں یہاں کراچی میں اپنے تایا کے ساتھ رہتا تھا۔ امی ابو گاؤں میں تھے اور بھائی مجھے الگ خرچا بھیجتے تھے۔ مجھے ایک بات کی خلش تھی کہ بھائی وہاں کی زندگی کا حصہ کیسے بن گئے۔ مجھے یہ پتا نہ تھا کہ ان کا مزاج خدمت کے سانچے میں ڈھل چکا ہے اور وہ خود سے وابستہ لوگوں کے لیے جی رہے ہیں، ان کی خوشیوں کا ایک حصہ بنے ہوئے ہیں۔

اصل میں ہم اپنے لیے جی رہے ہوتے ہیں۔ ہماری تمام تر کوششیں اپنے لیے ہوتی ہیں مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ ایسے کئی لوگ ہمارے آس پاس ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی

اس کی وجہ میڈم رتھ فاؤ تھیں، جنہوں نے تن تنہا اس بیماری کے خلاف کوششوں کا سلسلہ شروع کیا اور اس بیماری کو ختم کر کے دم لیا۔ بھارت میں کوئی رتھ فاؤ نہیں تھیں جو انہیں اس بیماری سے نجات دلواتیں۔ یہ واضح فرق تھا پاکستان اور بھارت میں۔

ایک شخصیت اور اتنا بڑا کارنامہ......! میں میڈم رتھ فاؤ کی شخصیت کے عکس میں گرفتار ہو گیا۔ ایک بہت خوب صورت لڑکی جیسے جرمن کی شہزادی ہو۔ اپنی فیملی، اپنے دوست احباب، اپنا ملک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ جاتی ہے اور جذام کے خلاف جدوجہد میں اپنی ساری عمر گزار کر آج 84 سال کی ہے اور جرمن لہجے میں کہتی ہے کہ یہ تھوڑے سے مریض رہ گئے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ان حالات سے نکل جائیں گے۔ پورے پاکستان سے یہ بیماری ختم کریں گے لیکن دوستی کبھی ختم نہیں کریں گے۔ دوستی اور محبت رہ جائے گی......! میں نے ایسے پُرخلوص، وطن پرست، پُروقار اور سادہ جملے کبھی نہیں سنے تھے۔

میں میڈم رتھ فاؤ کے بارے میں ہر وقت سوچتا رہتا تھا مگر ایک خلش پیدا ہو گئی تھی کہ میڈم رتھ فاؤ نے کیسے اپنا وطن چھوڑ کر ایک دوسرے ملک کو اپنی زندگی دے دی۔ یہ کون سا جذبہ ہوتا ہے

اور کیا میڈم اپنے پیاروں کی یاد میں اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاتی تو نہیں ہوں گی؟ میں اس جذبے کو سمجھنا چاہ رہا تھا اور شاید اس کی وجہ بھائی تھے جو اسی طرح لندن گئے تھے اور پھر لندن کے ہی ہو کے رہ گئے۔ میری الجھن کا حل میڈم رتھ فاؤ سے ملاقات کر کے ہی حل ہو سکتا تھا اور یہ موقع بھی آ گیا۔

وہ ایک سرکاری تقریب تھی۔ جذام کے مریضوں کو ظہرانہ دیا گیا تھا۔ میڈم مہمان خصوصی تھیں۔ ان کے لیے خیر مقدمی کلمات انگریزی میں ادا کیے گئے۔ پھر میڈم تقریر کے لیے بمشکل کھڑی ہوئیں تو انہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں اردو میں تقریر کی۔

وہ عجیب وغریب اور غیر معمولی لمحات تھے۔ ان کے چہرے پر بلا کا سکون، طمانیت اور خوشی تھی۔ وہ جذام کے مریضوں کے اعزاز میں منعقدہ تقریب پر بہت مسرور تھیں۔ ان کے چہرے پر مسحور کر دینے والی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بہت پُرکشش اور سحر زدہ شخصیت تھی ان کی۔

میں ان سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ کیا آپ خوش ہیں؟ اپنے فیصلے پر کبھی پچھتاوا تو نہیں ہوا؟ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے سچا جواب دیں گی۔ میں نے دیکھا کہ اب لوگ ان سے مل رہے ہیں۔ جذام کے نئے اور پرانے مریض ان سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا رہے ہیں۔ میں ان کے ذرا فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ ان کی آنکھوں میں جھانک کر ان سے ایک سوال کر سکوں۔ قریب تھا کہ میں انہیں پکارتا، ایک مریض نے میڈم کے ہاتھ کو چوم کر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''یہ میری ماں ہیں۔ یہ ہم سب مریضوں کی ماں ہیں۔ اللہ نے یہ ماں دے کر ہم پر بہت احسان کیا ہے۔''

میڈم نے اسے تسلی دی۔ وہ جذباتی انداز میں یہ کہتا ہوا مڑ گیا کہ ایک ماں جذام کی وجہ سے اسپتال میں پھینک گئی، دوسری ماں (میڈم رتھ فاؤ) نے گود لے لیا۔ آپ لوگ خود فیصلہ کر لیں کہ میری ماں کون ہے؟

میڈم کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے میری طرف دیکھا۔ جب میری نظریں ان سے چار ہوئیں تو مجھے لگا کہ اپنی نظروں سے پوچھ رہی ہیں کہ اور کچھ؟ کوئی اور سوال؟ حیرت انگیز طور پر مجھے یہی محسوس ہوا تھا۔

مجھے میرے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ سر جھکا کر آداب بجا لایا اور واپس آ گیا۔

اب مجھے پتا چل گیا کہ بھائی کیوں وہاں مستقل قیام پذیر ہو چکے ہیں۔ وہ جب بتاتے تھے کہ ڈیوڈ انہیں مس کر رہا ہے، جن کی آنکھ کا آپریشن ہونے والا ہے، سوزی میرے بغیر کسی کے ساتھ واک پر نہیں جاتی، جوزف کو ہر شام کو مجھ سے چاکلیٹ چاہیے ہوتی ہے تو مجھے ان باتوں سے بوریت محسوس ہوتی تھی۔ کچھ غیر حقیقی سی یہ باتیں لگتی تھیں، کیوں کہ میں انسانیت کی خدمت کے جذبے سے لاعلم تھا مگر میڈم رتھ فاؤ کی ایک مسکراہٹ نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا، میرے ہر سوال کا جواب مجھے مل چکا تھا۔ میں جو میڈم رتھ فاؤ کو لاجواب کرنے گیا تھا، خود لاجواب ہو کر واپس آ گیا۔

☆☆☆

اُردو میری زبان

اُدھیڑ بُن: اُدھیڑ بُن کے معنی ہیں متضاد خیالات سے پریشان ہونا۔ ایک کام کا منصوبہ باندھنا اور پھر اس کو نظر انداز کر دینا۔ اُدھیڑ بن دو الفاظ اُدھیڑ اور بن کا مرکب کلمہ ہے۔ اُدھیڑنا سے مراد سیون یا سلائی کا ٹانکا کھولنا اور بن سے مراد ہے (دھاگوں سے) کپڑا بننا۔ اُدھیڑ بن عمل اور ردِعمل کا نام ہے اور ایک نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ جس میں آدمی ذہنی کشمکش یا الجھن میں مبتلا رہتا ہے۔

اداس: اداس کے معنی ہیں غمگین یا رنجیدہ۔ اداسی کے معنی ہیں پریشانی اور ویرانی۔ ہندو فقیروں کے ایک فرقہ کا نام اداسین ہے۔ وہ ہمیشہ گھومتے رہتے تھے اور پریشانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اداسا کسنا کے معنی ہیں بدھنا بوریا سنبھال کر چل دینا۔ اوڑھنا بچھونا کندھے پر لاد کر چلتے بننا۔ اس طرح لفظ اداسی وجود میں آیا۔

غنہ: نون غنہ میں نقطہ غائب ہوتا ہے اس لیے جب کوئی اچانک غیر حاضر ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے غنہ دے دیا ہے۔

کیک: کاک میٹھی روٹی کو کہتے ہیں جس کے موجد قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔

ہونق: ہونق کے معنی ہیں کم سمجھ اور بے وقوف۔ ایک شخص تھا جو جوتوں کا ہار پہن کر رہتا تھا اور سادہ لوح اور بے وقوف تھا۔ اس سے اُردو لفظ ہونق وجود میں آیا۔

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

سراج سپر اسٹور

فرزانہ چیمہ
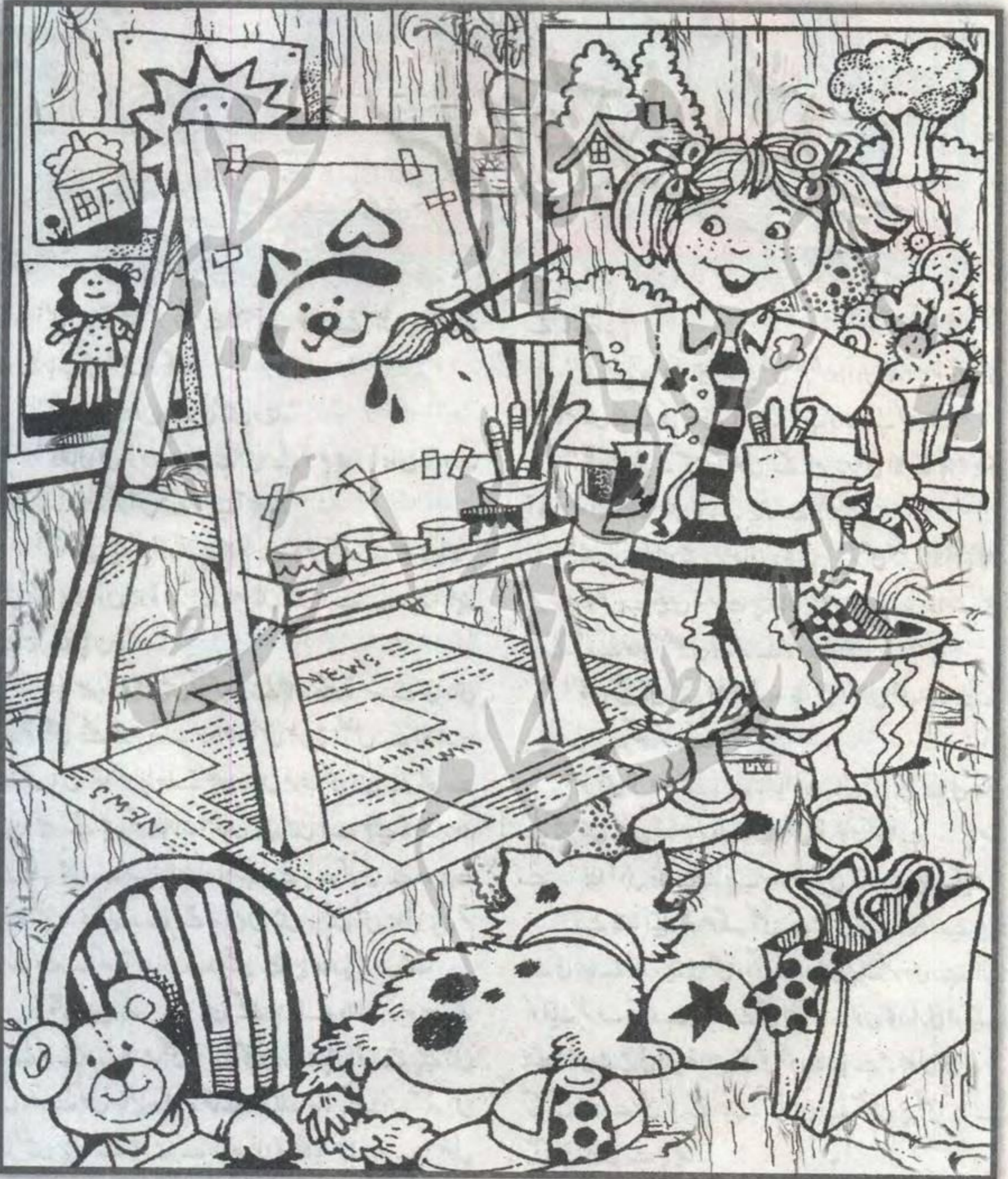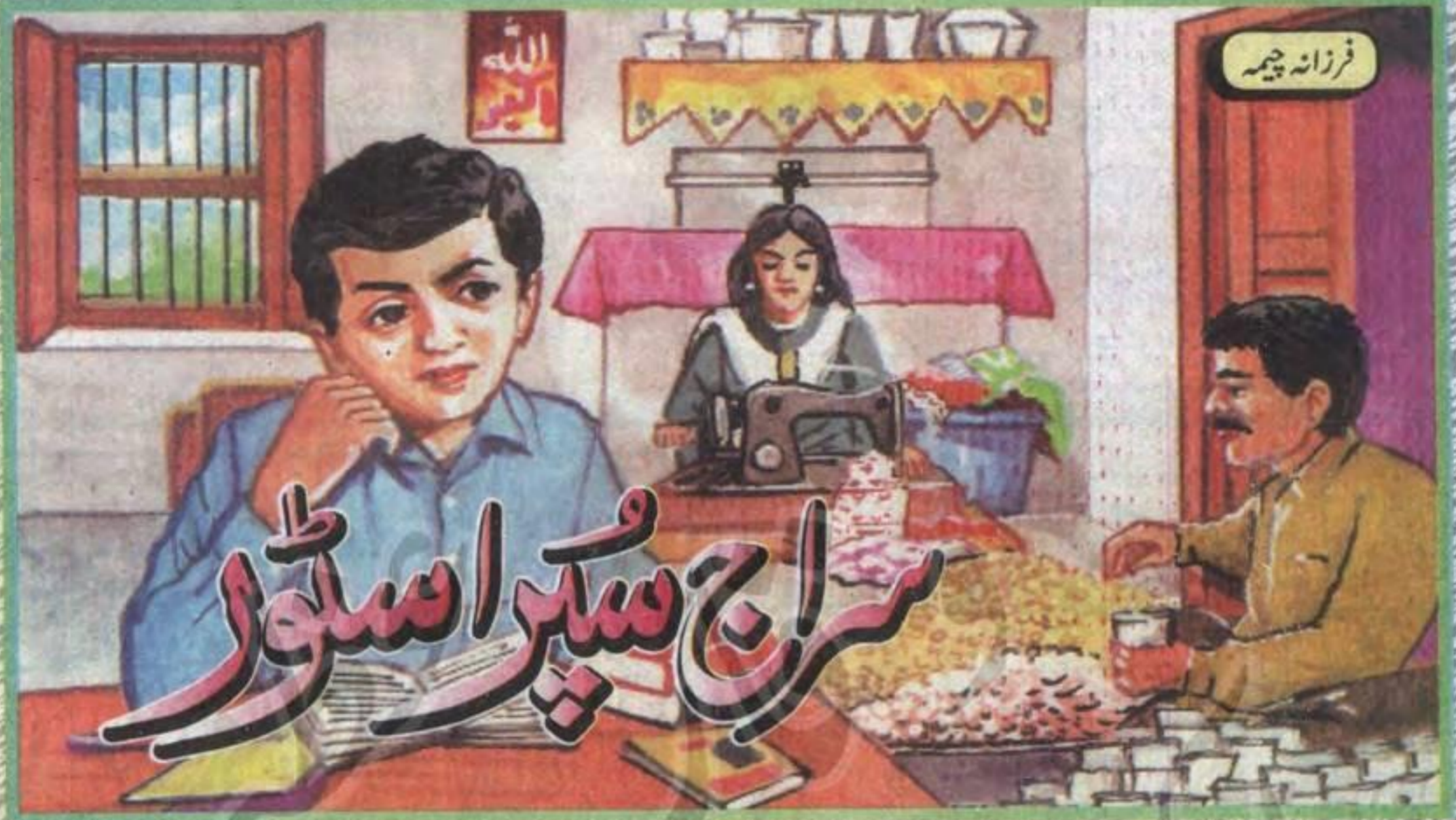
"ابا! یہ تو کیا کر رہا ہے؟" رب نواز نے سبق یاد کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

"کام کر رہا ہوں، دکھائی نہیں دیتا۔"

"دکھائی ہی تو دے رہا ہے اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔" رب نواز کتاب چھوڑ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

"تو سبق یاد کر اور اپنے کام سے کام رکھ۔ میں تیرے کام میں کبھی بولا ہوں جو تو میرے کام میں دخل دینے کے لیے آ بیٹھا ہے میرے پاس۔"

"ابا! میرے کام میں تو کیا بولے گا۔ مجھے تو حسرت ہی رہی کہ تو بھی مجھے ہوم ورک کرواتا، جس طرح افضل کے ابو اسے روزانہ پاس بٹھا کر پڑھاتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی اس نے مجھ سے زیادہ نمبر لیے ہیں مگر سالانہ امتحان میں مَیں اسے پیچھے چھوڑ کر دم لوں گا۔ میں نے اپنے ماسٹر صاحب سے بات کر لی ہے وہ بہت اچھے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے سردیوں میں راتیں لمبی ہوتی ہیں تم رات کو میرے گھر آ جایا کرو۔ دو تین گھنٹے پڑھا دیا کروں گا۔"

"چل چپ کر...... دو تین گھنٹے پڑھانے والا...... سو سو کے بدلے سرخ سرخ نوٹ بھی تو لے گا۔ میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔ تم نے کون سا پڑھ لکھ کر تھانے دار لگ جانا ہے۔ بس آٹھ دس جماعتیں پڑھ لے پھر میرے ساتھ خوانچہ لگایا کرنا دوسرے اسکول کے سامنے۔"

"میں تو پڑھ لکھ کر تیرا خوانچہ بھی ختم کروا دوں گا، الٹا تو مجھے بھی اسی کام میں لگانے کی سوچ رہا ہے۔" رب نواز تڑپ کر بولا۔

"چل خوانچہ نہ سہی، اسکول کے باہر ریڑھی لگا لینا پتر! بڑی آمدنی ہوتی ہے۔" اس کا باپ پیار سے بولا۔

"میں تو اسکول میں پڑھاؤں گا، باہر ریڑھی نہیں لگاؤں گا۔ پھر شام کو غریب بچوں کو مفت پڑھاؤں گا، اپنے ماسٹر صاحب کی طرح۔" رب نواز آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا۔

"چل شیخ چلی کہیں کا! اب سو جا، صبح اسکول بھی جانا ہے۔" باپ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تو بھی تو کام کر رہا ہے نا ابا! ادھر ماں بھی کپڑے سی رہی ہے پھر میں کیوں آرام کروں؟ مجھے بھی تو کام کرنا ہے...... پڑھنا ہے...... بڑا آدمی بننا ہے۔" رب نواز پھر اپنی کتاب پر جھک گیا۔

"لے پتر! ایک کلو مونگ پھلی کے بتیس لفافے بنا دیے ہیں سولہ کی بجائے اور ریوڑی بھی دوگنی تعداد میں پیک کر دی ہے۔ ان کو ایک طرف رکھ دے۔ سموسے صبح اٹھ کر بنا لوں گا۔ اری او نیک بخت! میں جو چربی لایا تھا اس کا گھی بھی بنا دیا ہے کہ بھول گئی......؟ صبح صبح سموسے بھی تو تلنے ہیں۔" سراج نے مشین پر جھکی کپڑے سیتی اپنی بیوی سے پوچھا۔

''ابا! یہ چربی کا گھی کون سا ہوتا ہے؟'' رب نواز پڑھتے پڑھتے چونک اٹھا۔

''یہ بھی ہوتا ہے پتر! سستا پڑتا ہے نا۔ تیرا کیا خیال ہے کہ بازار سے ڈبے والا گھی لا کر اس میں سموسے تلا کروں۔ مجھے اتنا بے وقوف سمجھا ہوا ہے تو نے؟''

''ابا! صحیح کام کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں کیا......؟'' رب نواز حیرانگی سے بولا۔

''ہاں، ہاں تو اور کیا...... گھاٹے کا سودا کون کرتا ہے بھلا؟ بھئی کم سے کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ کمانا کاروبار کا پہلا اصول ہے۔ بس پیسہ کماؤ چاہے جھوٹ سے کماؤ یا دھوکے سے۔''

''مگر ابا! میرے ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ دھوکہ دینے والا اور بے ایمانی کرنے والا مسلمان نہیں ہوتا۔''

''اوئے تو اپنی ٹرٹر بند نہیں کرے گا۔ میں نے تجھے کتنی بار کہا ہے کہ میرے کاموں میں نہ بولا کر اور ہاں! یہ ماسٹر صاحب کی کہانیاں مجھے نہ سنایا کر۔ میرے ساتھ تو کتابی باتیں نہ کیا کر، حسابی باتیں کیا کر۔'' سراج نے اسے غصے سے دیکھا۔

''حساب کی بات تو پھر یہ ہے ابا! تو نے چھٹانک کی بجائے آدھی چھٹانک مونگ پھلی لفافوں میں بھری ہے اور اسی طرح ریوڑی کے ساتھ کیا ہے مگر پیسے لے گا چھٹانک کے، ہے نا ابا......؟''

''ہاں تو پھر......؟ میں تو ہمیشہ ہی ایسے کرتا ہوں۔ آدھی چھٹی کے وقت بچوں کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ کوئی یہ دیکھتا ہی نہیں، سوچتا ہی نہیں تول کے متعلق، بچے اپنی پسند کی چیز لے کر خوشی خوشی بھاگ جاتے ہیں۔'' سراج نے اسے تفصیل بتائی۔

''ابا! کیا کوئی بھی نہیں دیکھتا'' سراج نے حیران ہو کر پوچھا۔

''دیکھنا کس نے ہے پتر! ہر کوئی اپنی اپنی ریڑھی پر اپنے اپنے گاہکوں کے ساتھ تو مصروف ہوتا ہے۔ ماسٹر لوگ اسکول کے اندر ہوتے ہیں، پھر دیکھنا کس نے ہے، راہ گیروں نے......؟'' سراج کا غصہ اب ختم ہو گیا تھا۔

''تم بھول رہے ہو ابا! کوئی نہ کوئی تو ضرور دیکھ رہا ہوتا ہے تجھے!'' سراج نے کچھ دیر کو سوچا پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''تو ہی دیکھتا ہو گا اپنے اسکول میں بیٹھ کر دوربین کے ساتھ اور تو کوئی نہیں دیکھنے والا۔''

''نہیں ابا! ایسے تو نہ کہو۔ اللہ تعالیٰ تجھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ہمارے ماسٹر صاحب کہتے ہیں......''

''اچھا، اچھا...... اب سو بھی جا! پھر ماسٹر صاحب کی کہانی شروع کر دی ہے۔'' سراج نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے بستے میں رکھ دی۔

رب نواز سراج کا ایک ہی بیٹا تھا۔ آج سے دس سال پہلے بڑی دُعاؤں کے بعد پیدا ہوا تو سراج کے باپ نے بڑے شوق سے ننھے بچے کو دیکھ کر کہا تھا:

''دیکھ سراج پتر! تجھے تیرے رب نے نوازا ہے۔ اولاد، رزق، دکھ سکھ، زندگی موت ہر چیز دینے والا وہی ایک رب ہے۔ تیرے پہلے تین بچے بھی اسی ذات نے تجھے دے کر پھر واپس لے لیے۔ اب یہ بھی اسی رحیم و کریم ذات نے کرم کیا ہے، میں نے اس کا نام رب نواز رکھ دیا ہے۔ رب سچا اسے بہت نوازے گا۔ میری بات یاد رکھنا سراج! یہ بڑا کرماں والا بچہ ہو گا۔''

رب نواز کرماں والا ثابت ہوا کہ اپنی پیدائش کے چار پانچ سال بعد اپنے ماں باپ کو گاؤں سے شہر لے آیا۔ رب نواز ابھی تین سال کا تھا کہ اس کا نام رکھنے والے، اس کے پیارے دادا جان فوت ہو گئے۔ ان کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ سراج کے دو بھائیوں نے دُکان اور مکان پر قبضہ کر کے، سراج کو لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ سراج کی بیوی ایک نیک اور سلیقہ مند عورت تھی جو لڑائی جھگڑے سے نفرت کرتی تھی۔ وہ سلائی کا کام جانتی تھی۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی نے سوچ سمجھ کر ایک دن شہر کی راہ لی۔ بیوی کی گود میں رب نواز تھا جب کہ سراج کی آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں ٹین کا ایک صندوق تھا جس میں چند ایک استعمال کے کپڑے اور دو چار کھانے کے برتن تھے اور تھوڑی سی نقدی۔

دن رات کی محنت کے بعد سراج کی بیوی نے تھوڑی تھوڑی رقم جمع کر کے سلائی مشین خرید لی تھی اور یوں اڑوس پڑوس کے کپڑے سی کر کچھ گزارا ہونے لگا تھا۔ یوں رب نواز ایک اسکول میں جی جان سے پڑھنے لگ گیا۔ سراج اتوار کے اتوار منڈی سے

خشک میوہ لے آتا اور ہفتہ بھر ایک اسکول کے آگے خوانچہ لگا کر بیچتا رہتا۔

اگلی صبح رب نواز اسکول جانے لگا تو ابا کا سامان دیکھتے ہی اسے رات کی سب باتیں یاد آ گئیں۔ اس کا دل پریشان ہو گیا۔ ماں کے پاس بیٹھ کر چائے اور روٹی کھاتے کھاتے اسے نہ جانے کیا خیال آیا، کہنے لگا: ''ماں! ابا کو تو ہی سمجھا۔ یہ بددیانتی کا کاروبار چھوڑ دے۔ ہمارے ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ دیانت داری سے کمائے ہوئے رزق میں برکت ہوتی ہے۔ جس میں دیانت نہیں اس میں دین نہیں۔''

''تیرے ماسٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں رب نواز! تیرے باپ کو کئی بار میں نے سمجھایا ہے کہ تھوڑا کھاؤ مگر ایمان داری سے کما کر اور حلال کر کے کھاؤ مگر وہ سنتا ہی کب ہے؟ میں نے تو اب مشین کی کمائی سے گھر چلانا شروع کر دیا ہے۔ تجھے بھی اسکول میں کھانے پینے کے لیے روپیہ دو روپے میں ہی دیتی ہوں تا کہ اس کی بے ایمانی کی روزی ہمارے گھر نہ آئے۔ میرا رب نواز اتنا پڑھے کہ ایک بڑا افسر بن جائے۔'' ماں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر بے شمار دعائیں دیں اور رب نواز دل ہی دل میں اپنے ابا کو ایمان داری سے کام کرنے کی طرف مائل کرنے کے مختلف طریقے سوچتا ہوا اسکول چلا گیا۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ اگلے چند روز میں سراج کو تیز بخار نے آ لیا۔ اتوار کو اچھا بھلا منڈی سے سارا سودا لے کر آیا مگر شام ہوتے ہی بخار نے آ لیا۔ سعادت مند رب نواز نے باپ کے کہے بغیر بھی اس کا کام سنبھال لیا۔ رات کو ماں کے ساتھ مل کر سارے لفافے تیار کیے۔ صبح ہمسایہ لڑکے کے ہاتھ پانچ دن کی چھٹی کی درخواست بھیج دی اور خود خوانچہ اٹھا کر ابا کے اسکول کی طرف چل دیا۔ چھٹی ہونے تک سودا بک چکا تھا۔ گھر آ کر کھانا کھایا اور نماز پڑھی اور بستہ اٹھا کر ماسٹر صاحب کے گھر چلا گیا تا کہ پڑھائی کا ہرج نہ ہونے پائے مگر دوسرے دن ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کا سارا مال آدھی چھٹی میں ہی فروخت ہو گیا اور وہ خوشی خوشی گھر لوٹ آیا اور باقی وقت اپنا سبق یاد کرتا رہا۔

ابا کا بخار اب اتر چکا تھا مگر رب نواز نے اسے کام پہ جانے سے روک دیا تھا۔ آج وہ پہلے سے دوگنا سامان پیک کر کے لے گیا تھا۔ وہ بھی ہاتھوں ہاتھ بک کر ختم ہو گیا۔ یوں ہفتے بھر کے لیے لایا ہوا سامان چوتھے روز ہی ختم ہو گیا۔ اس کا ابا یہ سن کر سخت حیران ہوا اور پوچھا:

''کاکا! تیرے پاس اتنی گاہکی کہاں سے آ گئی، میرا سامان تو چھٹی ہونے تک بلکہ اسکول کے بعد بھی بچا رہتا تھا اور ایک تو ہے کہ آدھی چھٹی میں ہی سارا مال بیچ بانٹ کر گھر آ جاتا ہے۔''

''ابا! اس دفعہ سامان کے پیکٹ میں نے تیار کیے تھے۔ پورا تول ڈالا تھا بلکہ ایک ایک، دو دو دانے اوپر ڈال کر لفافے پیک کیے تھے۔ بچے شاید اسی بات پہ خوش ہو گئے ہیں اور میرے خوانچے پر ٹوٹ ٹوٹ پڑے ہیں۔ ابا! میری مان تو بھی دیانت داری سے سودا بیچا کر۔ اللہ پاک بڑی برکت دے گا اس طرح اور پھر تو بیمار بھی نہیں ہوا کرے گا۔ اب دیکھو نا جتنی کمائی تو نے بے ایمانی سے کی ہے اس سے زیادہ تیری دوائیوں پر اور ڈاکٹر کی فیس پر لگ گئی ہو گی، تجھے کیا ملا؟ الٹا گناہ کمایا۔''

سراج کے دل پر بیٹے کی یہ خوب صورت باتیں شاید کچھ اثر کر رہی تھیں۔ اس نے پیار سے رب نواز کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

رب نواز اٹھ کر اس کی چارپائی پر آ بیٹھا اور باپ کی ٹانگیں دبانے لگا۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتا رہا۔

''ابا! میرے اچھے ابا! یہ کام چھوڑ دے نا، میری خاطر۔ تو ایک بار چھوڑ کے تو دیکھ۔'' رب نواز نے ایک جذبے سے درخواست کی۔ ''جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتا ہے، ابا وہ کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا تو ایک بار سچائی اور دیانت کا راستہ اپنا کر تو دیکھ۔'' اس کی خوب صورت آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ سراج نے اسے دیکھ کر پیار سے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ نہ جانے کون سا لمحہ تھا کہ اس کا دل بیٹے کی باتوں پر کچھ سوچنے لگا تھا۔ ''چل پتر! تو دل چھوٹا نہ کر۔ آئندہ سے میں بھی پورا تول رکھا کروں گا۔ تیرے ہی لیے کماتا ہوں، جب تو ہی اس کمائی پر خوش نہیں تو مجھے کیا مصیبت ہے ہیرا پھیری کر کے کمانے کی۔'' رب نواز یہ سنتے ہی خوشی سے نہال ہو گیا اور ماں کو خبر سنانے کے لیے بھاگ اٹھا۔

پیارے بچو! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اگر ہم نیکی کے راستے
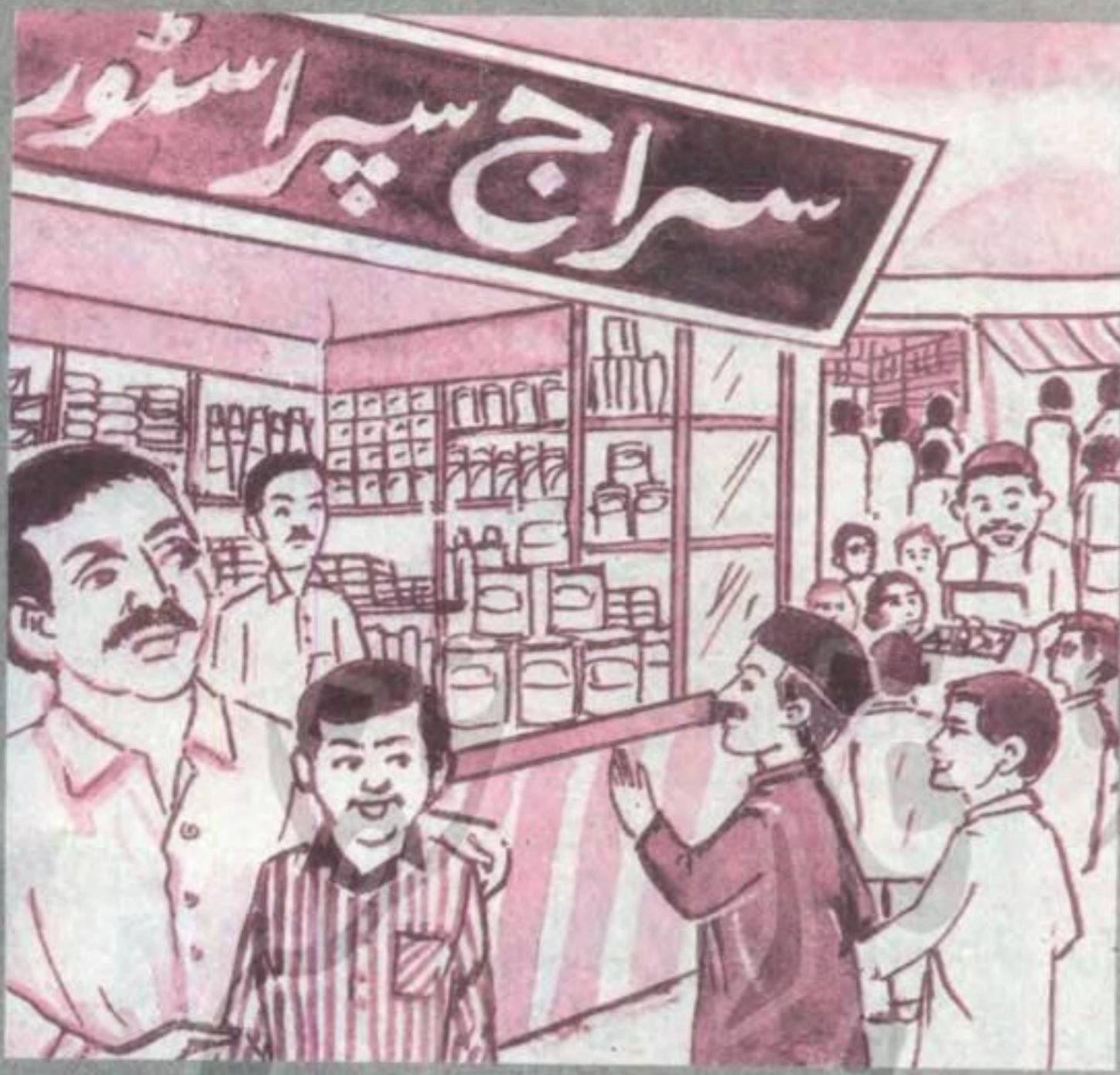
پر ایک قدم اٹھائیں تو اللہ تعالیٰ دس قدم بڑھ کر ہمارے لیے آسانیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی معاملہ سراج کے ساتھ پیش آیا۔

رب نواز کے کہنے پر اس نے بے ایمانی کرنا چھوڑ دی۔ چند روز بعد اچانک اس کا بڑا بھائی تاج دین اسے تلاش کرتا ہوا اس تک آ پہنچا۔ چند لمحے تو سراج آنے والے کو پہچان ہی نہ سکا۔ جب پہچانا تو پھر جھٹ اسے گلے لگا لیا۔ تاج پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیا ہوا میرے بھائی! حوصلہ کرو۔ بتاؤ تو سہی تمہارے بیوی بچے تو ٹھیک ہیں۔''

سراج جو اس کے یوں اچانک آ جانے پر خوش ہوا تھا، اب پریشان سا ہو گیا۔

تاج نے روتے روتے نفی میں سر ہلایا۔ پگڑی کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''خیریت کہاں ہے سراج! بس تم ہمیں معاف کر دو۔ سچے دل سے معاف کر دو، شاید اسی طرح ہماری مصیبتیں کم ہو جائیں۔''

''آخر ہوا کیا؟ کچھ پتا بھی چلے۔'' سراج نے اسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے شربت کا گلاس تھمایا۔

تاج نے شربت پیا۔ کچھ حوصلہ ہوا پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''سراج! لالچ نے ہم دونوں بھائیوں کو اندھا کر دیا تھا۔ ابا کی وفات کے بعد ہم نے تمہیں گھر سے کیا نکالا کہ مصیبتوں نے ہمارے گھر کا جیسے راستہ ہی دیکھ لیا۔ نہ کمائی میں برکت رہی، نہ گھر میں صحت رہی۔ میرا جوان بیٹا ہنستا کھیلتا فالج کا شکار ہو کر بستر پر آ لگا، بڑے بھائی کی بارش میں پھسل کر ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہمیں معاف کر دو سراج! ہم نے تمہارا حق مارا۔''

سراج اور اس کی بیوی حیرانی سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ تاج نے قمیص کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈھیر سارے نوٹ نکال کر سراج کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''یہ کیا میرے بھائی؟'' سراج حیران ہو گیا۔

''سراج! میرے چھوٹے بھائی! یہ تمہارا وہ حق ہے جو ہم نے دبا لیا تھا اور تمہیں بیوی بچے سمیت گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اب اللہ نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ابا کے مکان اور دُکان میں تمہارا جو حصہ بنتا تھا، وہ میں لے کر آیا ہوں۔ پورے ایک لاکھ روپے ہیں، گن لو۔ اس کے بدلے تم نے ہمیں معاف بھی کرنا ہے اور دعا بھی کرنی ہے۔'' تاج نے سراج کے دونوں ہاتھ تھام کر التجا کی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی رب نواز اپنے ماسٹر صاحب کے ساتھ ایک دُکان پر کھڑا تھا جس کے دروازے پر سبز ربن بندھا تھا۔ رب نواز کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی قینچی تھی۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف مٹھائی کی ٹوکری پڑی تھی۔

ٹھیک گیارہ بجے ماسٹر صاحب نے تلاوتِ قرآن پاک کی تلاوت کی اور دعا کی، پھر دُکان کے دروازے پر بندھا ربن کاٹا۔ مبارک، سلامت کا شور اٹھا۔ ماسٹر صاحب نے دُکان کا دروازہ کھولا۔ اندر ایک سجا سجایا جنرل اسٹور تھا۔ ماسٹر صاحب نے نہایت محبت سے سراج کا بازو پکڑا اور اسے دُکان کے اندر لے جا کر کاؤنٹر پر لا بٹھایا۔ رب نواز کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس کا

خواب آج حقیقت بن گیا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر اوپر دیکھا جہاں خوب صورت بورڈ پر سراج اسٹور کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

ادھر سراج ہر پوچھنے والے کو اپنی کہانی سنا رہا تھا کہ کس طرح وہ ایک خوانچہ فروش سے ایک جنرل اسٹور کا مالک بن گیا ہے۔ وہ رب نواز کی تعریفیں کرتا نہیں تھکتا تھا جس نے اسے ایمان داری کا درس دے کر سیدھا راستہ دکھایا تھا اور جس کی بدولت اللہ پاک نے اسے اتنا نوازا تھا۔ جو بھی سراج کی یہ کہانی سنتا، دل ہی دل میں خود بھی دیانت و امانت کے راستے پر چلنے کا عہد کر لیتا۔ سچ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ آج یہ چھوٹا سا جنرل اسٹور سراج سپر اسٹور میں بدل چکا ہے جب کہ رب نواز بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اسی شہر کے ایک کالج میں پڑھاتا ہے اور اپنے ماسٹر صاحب کی طرح غریب بچوں کو مفت پڑھاتا ہے۔

یوم مئی (May Day)

زمانہ قدیم میں یہ دن مشہور رومی دیوی مے آیا کی نسبت سے منایا جاتا تھا۔ اس روز لوگ مئی پول (Maypole) اور مارس ناچوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ انگلستان میں بھی یہ دن یکم مئی کو منایا جاتا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت موسمی تہوار کی سی تھی۔ بعد میں اسے مذہبی رنگ میں رنگ لیا گیا۔ یہ تہوار انیسویں صدی کے آخر تک منایا جاتا رہا لیکن 1886ء میں جب مزدور اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اسے دنیا بھر میں منایا جانے لگا۔ اس کے لیے مزدوروں نے 1827ء میں فلیڈیلفیا میں پہلی ٹریڈ یونین قائم کر کے غیر معینہ اوقات کار کو کم کر کے کم از کم دس گھنٹے مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ 1834ء میں نیویارک میں بیکری کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی کیونکہ وہ اوسطاً روزانہ اٹھارہ سے بیس گھنٹے کام کرتے تھے اور انہیں کسی قسم کی سہولت میسر نہ تھی۔ 1837ء میں امریکی حکومت نے سرکاری ملازمین اور صنعتی مزدوروں کے لیے دس گھنٹے اوقات کار مقرر کیے۔ امریکا کے مزدوروں کی تقلید کرتے ہوئے برطانیہ کے ساڑھے تین لاکھ مزدوروں کے دستخطوں سے 2 اگست 1842ء کو پارلیمنٹ میں ایک یادداشت پیش کی گئی، ماسوائے ایک رکن کے کسی رکن نے بھی اس یادداشت کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بنایا۔ اس رکن نے محنت کشوں کے مطالبات کی حمایت میں کہا تھا کہ اس پارلیمنٹ سے درخواست کرنا جبل الطارق کی چٹانوں سے رحم کی درخواست کرنے کے مترادف ہے۔ یکم مئی 1886ء کو شکاگو کے تمام کارخانوں کے مزدوروں نے اوقات کار آٹھ گھنٹے مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ 2 مئی سے 6 مئی تک شکاگو کے تمام کارخانوں میں ہڑتال رہی اور اس دوران مزدوروں نے جلسے کیے، جلوس نکالے۔ 3 مئی 1886ء کے جلسے کو درہم برہم کرنے اور مزدوروں کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے پولیس نے نہ صرف بم کا دھماکہ کرایا، بلکہ نہتے مزدوروں پر فائرنگ بھی کی، جس کے نتیجے میں کافی تعداد میں محنت کش اور پولیس والے مارے گئے۔ 4 مئی کو مشتعل مزدوروں پر پولیس کے علاوہ فوج نے بھی فائرنگ کی جس سے شکاگو کے گلی کوچے مزدوروں کے خون سے رنگے گئے۔ شہید مزدوروں کے اس خون سے ایک مزدور نے سفید کپڑے کو رنگ کر محنت کشوں کو عالمی پرچم عطا کیا۔ 5 مئی کو پولیس نے متعدد مقامات پر چھاپے مارے اور سات مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر کے انھیں تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ان رہنماؤں کی قربانی کے نتیجے میں امریکی حکومت نے مزدوروں کے اوقات کار میں دو گھنٹے کی تخفیف کر دی اور آٹھ گھنٹے مقرر کر دیئے۔ چنانچہ یکم مئی کا دن شکاگو کے مزدور شہیدوں کی یاد میں ہر سال منایا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس دن نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی اور 1890ء سے یہ تہوار دنیا بھر میں منایا جا رہا ہے، سرکاری تعطیل ہوتی ہے۔ سرکاری طور پر پاکستان میں یہ تہوار سب سے پہلے یکم مئی 1973ء کو منایا گیا اور اب ہر سال باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔ اس روز دفاتر اور کارخانوں میں سرکاری تعطیل ہوتی ہے۔

ٹیپو سلطان کا رجسٹر

ہندوستان کی میسور ریاست کے حکمران ٹیپو سلطان کے نام سے آپ میں سے ہر کوئی آگاہ تو ضرور ہوگا۔ یہ نہایت بہادر اور غیور تھا۔ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کا زبردست خواہش مند تھا۔ فراست، لیاقت، بصیرت اور شجاعت جیسی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ نماز روزے کا پابند ایسا کہ تہجد گزار بھی تھا۔ اس کی دلیری اور شجاعت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں انگریزوں کو اس قدر شکستیں دیں کہ مجبور ہو کر انہوں نے اس کے ساتھ صلح نامہ منگلور 1784ء کر لیا۔

حیدر اور فاطمہ بی بی کے اس قابل فخر بیٹے کی ولادت 21 دسمبر 1751ء میں جمعہ کے روز ہوئی۔ فتح علی نام رکھا گیا۔ اپنے ایک بزرگ ٹیپو مستانی کی عقیدت میں اس نام کے آگے ٹیپو کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح پورا نام فتح علی ٹیپو سلطان ہوا مگر شہرت ٹیپو سلطان کی حیثیت سے پائی۔ تخت نشینی کے وقت ٹیپو کی عمر تیس سال تھی۔

پیارے بچو! علامہ اقبال کے مردِ مومن کو اگر مجسم صورت میں دیکھنا ہو تو ٹیپو سلطان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ براعظم پاک و ہند کی تاریخ میں اس مردِ مومن کو ایک لازوال اہمیت اور حیثیت حاصل ہے جو صرف 48 سال کی عمر میں اپنے ہی غدار اور منافق لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو کر شہادت کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ٹیپو سلطان نہ صرف ایک مرد مجاہد تھا بلکہ وہ ایک عالم بھی تھا...... ایک تجربہ کار سیاست دان بھی تھا...... بہترین سپہ سالار بھی تھا...... بہترین منتظم بھی تھا...... ایک غیر معمولی بصیرت رکھنے والا قائد بھی تھا۔ اپنے سترہ، اٹھارہ سالہ دورِ حکومت میں وہ ایک لمحہ بھی آرام و چین سے نہ بیٹھا ہوگا۔ وہ مرہٹوں اور انگریزوں کو ناکوں چنے چبوانے کے ساتھ ساتھ رعایا کی بہتری اور بھلائی کے کاموں میں بھی دن رات مصروف رہتا۔

ٹیپو سلطان نہ صرف اپنی رعایا میں ہر دلعزیز تھا بلکہ پوری امت مسلمہ کا ہیرو اور خاص کر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے دل کی دھڑکن ہے۔ انگریزوں اور مرہٹوں کے تابڑ توڑ حملوں کا مقابلہ کرنے والا ٹیپو سلطان سیاسی، مالی اور تجارتی انتظام کو بہترین شکل دینے کے لیے دن رات جو محنت کرتا تھا اس کی ایک شکل خط لکھنے کی بھی تھی۔ وہ جو بھی خط لکھتا اس کی ایک نقل (حرف مضمون کی حد تک) اپنے رجسٹر میں بھی درج کیا کرتا تھا۔ اس طرح ان کے خطوط سے کئی رجسٹر بھر گئے تھے۔

پیارے بچو! آج آپ ٹیپو سلطان کے اس رجسٹر کے چند خطوط پڑھیں گے۔ ان خطوط کے آئینہ میں ٹیپو سلطان کی خوب صورت شخصیت مزید نکھر کر آپ کے سامنے آئے گی۔ کاش! آج ہمیں بھی کوئی ٹیپو مل جائے تو یہ ارض پاک صحیح معنوں میں پاکستان بن جائے۔ اے کاش! تو لیجیے! ٹیپو سلطان کے خط پڑھیے!

"بنام محی الدین خاں۔۔۔ (31 / اگست 1785ء)

تمہارے متعلق اطلاع ملی ہے کہ دفتر میں حاضری کے عوض تم اپنا سارا وقت گھر میں گزارتے ہو۔ یہ مناسب نہیں۔ تم کو چاہیے کہ دفتر میں مناسب وقت ٹھہر کر امورِ سرکار کی طرف توجہ کرو اور کسی شخص کو بھی سرکاری کام کے متعلق تمہارے گھر پر آنے کی تکلیف نہ ہو۔"

"بنام محی الدین علی خاں۔۔۔ (18 / ستمبر 1785ء)

معلوم ہوا ہے کہ تم نے نہایت سختی سے کام لے کر بہت سے لوگوں کے مکانوں کو ڈھا دیا ہے جن میں وہ سال ہا سال سے رہتے تھے اور جن کی تعمیر میں انہوں نے بہت سا روپیہ خرچ کیا تھا۔ اس قسم کی کارروائی نہ صرف ہماری خوشی اور مرضی کے خلاف ہے بلکہ لوگوں کو بدظن بھی کر دے گی۔ یہ مستبدانہ کارروائی فوراً بند ہونی چاہیے اور آئندہ لوگوں کو گھروں سے نہ نکالا جائے۔ تم کو جو صحیح احکام دیے گئے ہیں صرف ان پر عمل کرو۔ اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہ کیا جائے۔"

"بنام محمد غیاث و نور محمد خاں۔۔۔ (23 ستمبر 1785ء)

دسہرہ کا تہوار قریب ہے۔ اس موقع پر آپ کے ماتحتوں میں جو ہندو ہیں انہیں ہر دس آدمیوں کے پیچھے ایک بکرا دیا جائے اور ذی الحجہ میں اسی حساب سے مسلمانوں کو بھی بکرے دیے جائیں۔"

"بنام فراست خوجہ اعتمادی۔۔۔ (21 دسمبر 1785ء)

تمہاری مرسلہ فہرست ادویات میں چند ایسے عطریات کے نام مندرج پائے گئے ہیں جو یورپین ملکوں کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا حکیم محمد بیگ سے مشورہ کر کے تم ان کی بجائے یونانی ادویات تجویز کرو۔"

سلطان کی وطن پرستی مشہور بلکہ ضرب المثل ہے۔ سلطان نے عمر بھر سوائے اپنے ملک کے بنے ہوئے کپڑے کے دوسرے کسی ملک کا بنا ہوا کپڑا انہیں پہنا۔ ایک دفعہ منگلور کے چند تاجروں نے مدراس سے نمک منگوایا تو اس نے حکماً اس کی فروخت بند کر دی اور ان تاجروں کو نمک واپس کرنے پر مجبور کیا۔ اس خط سے بھی اس کی وہی وطن پرستی ظاہر ہوتی ہے۔

"بنام محمد اشرف۔۔۔ (15 اکتوبر 1785ء)

تم نے لکھا ہے کہ "قطب الدین خاں فوجدار ادھونی کو آپ نے پچاس ہزار روپے بھیج دیے ہیں اور ستر ہزار روپے ابھی خزانے میں بچے ہوئے ہیں۔" اور تم نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ "تم جمع بندی (لگان وصولی) کے لیے افسروں کو بھیجنے والے ہو۔" اور ساتھ ہی لکھا ہے کہ "بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے لگان کی وصولی میں کچھ دیر لگے گی۔" خیال ہے کہ بارشوں کے نہ ہونے سے غریب رعایا کو سخت تکلیف ہوگی لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنے ماتحت علاقے میں انہی افسروں کے ذریعے اناج وغیرہ کی مفت تقسیم کا انتظام کرو۔

انسانی ہمدردی کا اس موقع پر یہی تقاضا ہے۔ امید ہے کہ خدائے پاک اپنے کرم و شفقت سے جلد بارانِ رحمت بھیج دے گا۔"

آخر میں ہم آپ کو اس مردِ مجاہد کی زندگی کا آخری دن ...... کہ جس کی شام کو شہادت کی خلعت فاخرہ پہن کر وہ اپنے رب...... اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہوگیا...... اس دن کی تھوڑی سی روداد ضرور سنائیں گے نجانے آپ میں سے کون کون اپنے وقت کا ٹیپو ثابت ہو۔ باطل کے آگے نہ جھکنے والا...... حق کے لیے سب کچھ وار دینے والا۔ تو سنیے!

"یہ 4 مئی 1799ء کی صبح کا واقع ہے۔

سلطان نمازِ صبح کے لیے مسجد میں آیا۔ ملا حسن قادری نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد میر حبیب اللہ نے عادت کے خلاف بڑی جرأت سے روبرو آ کر کہا کہ آقا! گو صلح نامہ کی شرائط میں ملک کا نقصان ہے اور ہرجانہ جنگ سے خزانہ عامرہ پر بار پڑتا ہے اور قوم فرانسیسی کے پناہ گزینوں کو انگریزوں کے سپرد کر دینے سے پست ہمتی نظر آتی ہے لیکن وقت کے تقاضے کو مدنظر رکھ کر جان عزیز پر رحم فرمائیے۔ شہزادے اور شہزادیوں کی یتیمی و اسیری پر شفقت فرمائیے۔

اقبال کے مردِ مومن جیسے مردِ مجاہد ٹیپو کا جواب غور سے سننے اور سن کر یاد رکھنے کے قابل ہے، فرمایا:

"یہ ملک خداداد علی العموم سب رعایا کا ہے اور علی الخصوص مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ مابدولت نے سات سال (یعنی 1792ء میں صلح سرنگا پٹم کے بعد) تک بہت کچھ اس کی نگہداشت کی تدبیریں کیں لیکن اکابرین سلطنت در پردہ اس کی تباہی میں مصروف رہے۔ اب اپنے اپنے اعمال و نیات کے ثمر سے مستفید ہونا لازم ہے۔ انہی مابدولت کی ذات خاص ...... اولاد ...... اور جان و مال، انہیں میں دین محمدیؐ پر نثار کر چکا ہوں۔"

کرنل ٹبسن نے اپنی کتاب میں سلطان کے پرائیویٹ سیکرٹری میر حبیب اللہ کی زبانی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ سلطان نے کہا تھا:

"چونکہ انسان کو صرف ایک ہی دفعہ موت آتی ہے اس سے ڈرنا لاحاصل ہے اور یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ کب اس کو موت آئے گی کیوں کہ مرنا تو برحق ہے۔ دو سو سال بکرے کی طرح جینے سے میں شیر کی دو دن کی زندگی گزارنا پسند کرتا ہوں۔"

کوے اور لالیاں

(صالح جوئیہ، ملتان)

کائیں...... کائیں...... کائیں...... کوے نے شور مچایا۔

چودھری فہیم نے ایک نظر کوے کی طرف دیکھا جو اس کی حویلی کی دیوار پر بیٹھا شور مچا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اڑانا چاہا۔ کوا اڑ کر پھر اس کی دیوار پر آ بیٹھا۔

''چودھری صاحب! مہمان دی آمد دا اعلان کریندا پے۔'' چودھری صاحب کے نوکر کرمو نے کہا۔ ''وہ تو مجھے بھی پتا ہے آج مہمانوں نے آنا ہے، پھر یہ سرکیوں کھا رہا ہے۔ اس کو اڑا یہاں سے۔'' چودھری نے کرمو سے کہا۔ کرموں اس کو اڑانے کے لیے پتھر مارنے لگا۔ کوا اڑ جاتا اور گھوم پھر کر واپس دیوار پر آ بیٹھتا۔

آج چودھری فہیم کی حویلی میں قرآن خوانی تھی۔ بہت سے مہمانوں کی آمد متوقع تھی اور ان کی خاطر تواضع کے لیے چاول کی دیگیں پک رہی تھیں۔ مہمانوں کی آمد شروع ہوئی تو دیکھتے ہی دیکھتے پورا پنڈال لوگوں سے بھر گیا۔ سب مہمان قرآن خوانی میں مصروف ہو گئے۔ دوسری طرف کوے نے شور مچا مچا کر اپنے بہت سے ساتھیوں کو جمع کر لیا اور حویلی کی دیوار پر ڈیرے ڈال لیے۔

اب کوے بھی خاموش تھے۔ کبھی کبھی کوئی کوا ''کائیں'' کی آواز نکالتا تو سب کوے کائیں...... کائیں کی آواز نکال دیتے۔ قرآن خوانی میں مصروف لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھ جاتیں۔ چاول پک چکے تو ان کی خوشبو چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ لوگ جلدی جلدی قرآن خوانی کر کے چاولوں سے لطف اندوز ہونا چاہ رہے تھے۔

قرآن خوانی سے فارغ ہوئے تو مولوی صاحب نے تھوڑا سا خطاب فرمایا۔ اس میں لوگوں کو دین اسلام پر چلنے اور حضور ﷺ کی سنتوں پر عمل کرنے اور نماز کی پابندی کرنے کا درس دیا۔ اس کے بعد دعا ہوئی اور پھر چودھری فہیم کے نوکر مہمانوں میں چاول تقسیم کرنے لگے۔ لوگ چاولوں پر ٹوٹ پڑے۔

کائیں...... کائیں...... کائیں...... ایک مرتبہ پھر شور ہوا، مگر اب کی بار لوگوں نے اس آواز پر توجہ نہ دی۔ اب صرف وہ کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ ان کو آس پاس کی کوئی خبر نہ تھی۔

کائیں...... کائیں...... ان سب کووں کے سردار کوے نے کی تھی اور وہ صبح سب سے پہلے حویلی کی دیوار پر آ کر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''دوستو! میرے خیال میں آج کے مشن کے لیے ہم سب کافی ہیں۔'' ''جی سردار......!'' سب کوے بیک زبان بولے۔ ''بہت اچھے......! شاباش...... جوانو! آپ کا حوصلہ اور اتحاد دیکھ کر میرا حوصلہ بھی بڑھ گیا ہے۔'' سردار کوے نے کہا۔ ''میں صبح جب یہاں آیا تو مجھے لگا کہ ہم اس مشن کو ٹھیک سے مکمل نہیں کر سکیں گے، کیوں کہ ہماری تعداد ان انسانوں کی تعداد سے بہت کم ہے اور پھر مزے کی بات یہ کہ میری توقع سے زیادہ یہاں لوگ جمع ہوئے ہیں۔'' سردار کوے نے کہا۔

''جی سردار صاحب! لوگ تو واقعی بہت زیادہ ہیں پورا پنڈال ہی بھر گیا ہے۔'' ایک کوے نے سردار کوے کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''بالکل جی...... لوگ کیوں نہ جمع ہوتے...... ایک تو گاؤں کے چودھری کی حویلی میں ختم قرآن پاک کی محفل، اوپر سے چاول بھی مشہور باورچی نے پکائے۔ لوگ قرآن خوانی سے زیادہ چاولوں کی خوشبو سے جمع ہوئے ہیں۔'' ایک کوے نے اپنے تجربے کی بات بتائی۔

''لالہ! اج تے چاول کمال پکائے...... چاولاں دی خوشبو نے سارے پنڈ دے کاں جمع کر ڈیتے۔'' ایک دیہاتی نے چاول منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ آدھے چاول منہ میں اور آدھے زمین پر تھے۔

''کائیں...... کائیں......'' کووں کو اس کی بات ناگوار گزری اور وہ چلائے۔

''خاموش......!'' سردار کوے نے سب کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ سب خاموش ہوئے تو وہ بولا۔ ''دوستو! یہ تو نادان ہے...... اس کو تو خبر نہیں ہم کس مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس کی بات کا برا مت مانو...... اپنے مشن کی کامیابی کی فکر کرو۔''

''معافی چاہتے ہیں ہم سب۔'' سب کوے بولے۔

"سردار کیا ہم اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب ہو جائیں گے......؟" ایک کوے نے سوال کیا۔

"ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور......" سردار کوے نے کہا۔ "مگر سردار! یہاں لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم پوری طرح سے اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے۔" ایک کوے نے خدشہ ظاہر کیا۔

"سردار کوے۔" اچانک آواز آئی۔ کوے نے آواز کی سمت دیکھا تو لالی (شارک) پیپل کے درخت پر بیٹھی ان سے مخاطب ہوئی تھی۔ "کیا بات ہے بی لالی......!" سردار کوے نے پوچھا۔ "سردار اگر برا نہ مانیں تو......ہمیں بھی اس مشن میں شامل کر لیں۔ میں اپنی سب سہیلیوں کے ساتھ اس درخت پر موجود ہوں۔ بس آپ کی اجازت کی طلب گار ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم سب کو بھی اس مشن میں شمولیت کا شرف حاصل ہو جائے گا اور اس نیک مشن کا ثواب بھی مل جائے گا۔" لالی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ سردار کوے نے اس کی خواہش کا احترام کیا اور خوش دلی سے اپنے مشن میں شامل کر لیا۔ اب ساری لالیاں بھی حویلی کی دیوار پر موجود تھیں۔

سردار کوے نے اپنے نوجوانوں کو ان کی ذمہ داری سونپ دی تاکہ پوری حکمت عملی کے ساتھ حملہ کیا جائے اور اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوسکیں۔ حکمت عملی یہ طے کی گئی کہ سب سے پہلے اس جگہ حملہ کیا جائے گا جہاں چاول کم تقسیم کیے گئے کیوں کہ وہاں چھینا جھپٹی ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ رزق زمین پر گرنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اپنے منصوبے کے مطابق کووں کے پہلے ٹولے نے حملہ کیا اور پوری کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح جیسے جیسے لوگ اپنی جگہ سے اٹھتے چلے گئے، کوے اور لالیاں اس جگہ سے چاول کھاتی رہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری حویلی خالی ہو گئی اور اللہ پاک کی اس مخلوق نے اپنے مشن (رزق کی بے قدری) میں کامیابی حاصل کی۔

"دوستو! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ سب نے میرا ساتھ دیا۔ آپ کے تعاون سے اللہ پاک کی انمول نعمت......لوگوں کے پاؤں کے نیچے آنے اور گندگی کے ڈھیروں پر پھینکنے سے بچ گئی اور ہم سب کا پیٹ بھی بھر گیا۔" سردار کوے نے کہا تو سب لالیوں اور کووں نے خوشی سے شور مچایا۔ کائیں......کائیں......کائیں......

سردار فہیم بولا۔ "او کرمو! ان کووں کو تو اڑا صبح سے سر کھا رہے ہیں۔ سارے چاول کھا کر بھی ان کا پیٹ نہیں بھرا......؟؟"

اخلاقی سبق: حیوانات رزق کی بے قدری نہیں کرتے۔

(پہلا انعام: 150 روپے کی کتب)

اپریل فول

(عائشہ ادریسی، علی پور)

"امجد! آج میں بہت خوش ہوں۔" احمد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ امجد کے ساتھ بیٹھے ارسلان نے بھی یہ بات سن لی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی احمد سے پوچھ لیا۔ "اور تمہاری خوشی کی وجہ کیا ہے؟" احمد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کتنے بے وقوف ہو، سب کچھ بھول جاتے ہو۔ ارے کل یکم اپریل ہے۔" "تو پھر ہم کیا کریں اور اس میں خوش ہونے والی کون سی بات ہے؟" امجد اور ارسلان یک زبان ہو کر بولے۔ احمد نے قہقہہ لگایا اور پھر گویا ہوا۔ "پھر کر دی نا بے وقوفوں والی بات، کل یکم اپریل ہے یعنی اپریل فول۔" "اوہ! ہم تو بھول ہی گئے تھے۔" امجد اور ارسلان پھر یک زبان ہو کر بولے۔ اس پر احمد نے کہا۔ "چلو کوئی بات نہیں، میں نے یاد دلا دیا نا! دیکھو نا، میں کتنا سمارٹ ہوں۔" احمد نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ ارسلان اور امجد قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ تینوں ایک گروپ پر مشتمل تھے اور ان کے گروپ کا نام "ناٹی گروپ" تھا۔ ان تینوں کے گروپ کا نام سارے اسکول نے مل کر تجویز کیا تھا کیوں کہ یہ تینوں لڑکے اسکول کے سب سے شرارتی لڑکے تھے۔ بس ان تینوں کو خوف تھا تو اپنے اسکول کی ٹیچرز کا۔ امجد نے احمد اور ارسلان کے ساتھ مل کر "اپریل فول" کی تیاریاں کرنا شروع کر دیں۔ امجد اور ارسلان نے مختلف مشورے تجویز کیے کہ کس طرح کل کے دن اسکول کے بچوں کو فول (پاگل) بنایا جائے۔ احمد نے ایک مشورہ ایسا تجویز کیا کہ لمحہ بھر کو خاموشی چھائی رہی پھر ارسلان اور امجد گویا ہوئے۔ "یار احمد! کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ایسے تو ہم اسکول سے نکالے بھی تو جا سکتے ہیں؟" دراصل احمد کا مشورہ ہی کچھ ایسا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس دفعہ ہم بچوں کے ساتھ ساتھ تمام ٹیچرز کو بھی فول بنائیں گے۔ ان تینوں نے ہر سال "اپریل فول" کے دن اسکول کے تمام بچوں کو تو فول بنایا تھا لیکن کبھی انہوں نے ٹیچرز کے ساتھ ایسا کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اسی لیے امجد اور ارسلان گھبرا رہے

تھے۔ ''نہیں یار! کچھ نہیں ہو گا چھوٹے سے مذاق سے کیا میڈم اور ٹیچرز ہمیں اسکول سے نکال دیں گی۔'' احمد نے ارسلان اور امجد کی گھبراہٹ کو دیکھ کر کہا۔ ''نہیں نہیں! ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے اگر ایک دفعہ ہمیں اسکول سے باہر نکال دیا گیا تو پھر کسی بھی اسکول میں داخلہ لینا مشکل ہو جائے گا۔'' ارسلان اور امجد پھر گویا ہوئے۔ ''ارے یار! کچھ نہیں ہو گا۔ اچھا چلو میں ضمانت دیتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔'' احمد نے پھر دونوں کی حوصلہ افزائی کی۔

آخرکار احمد کی تمام تر کوششوں کے بعد ارسلان اور امجد مان ہی گئے اور تمام ٹیچرز کو فول بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اللہ اللہ کر کے یکم اپریل کا سورج طلوع ہوا۔ ''ناٹی گروپ'' کے تینوں افراد اسکول پہنچ چکے تھے۔ اب منصوبہ کے مطابق ان تینوں نے سب کو فول بنانا شروع کر دیا تھا۔ کبھی احمد کسی بچے کو کہتا، دیکھو دیکھو! تمہارے کپڑوں پر کیڑا چڑھا ہوا ہے تو کبھی ارسلان کسی بچے کو کہتا، تمہارے سر پر بچھو جا رہا ہے۔ اب منصوبے کے مطابق ٹیچرز کو فول بنانے کی باری آئی تو احمد نے کہا کہ سب سے پہلے ٹیچر انیلا کو فول بنایا جائے۔ ٹیچر انیلا اسکول کی سب سے زیادہ غصیلی ٹیچر تھیں۔ چنانچہ ارسلان اور امجد میں ہمت نہ ہو رہی تھی کہ وہ ٹیچر کو جا کر فول بنائیں۔ آخر احمد نے ہی ہمت کی اور ٹیچر کی طرف چل پڑا۔ سب سے پہلے احمد نے ٹیچر کو جا کر سلام کہا اور پھر خاموشی سے ٹھہر گیا جب کہ ٹیچر انیلا بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہو گئیں۔ احمد نے موقع دیکھتے ہی فوراً کہا۔ ''ٹیچر، آپ کے دوپٹے پر چھپکلی جا رہی ہے۔'' یہ سننا ہی تھا کہ ٹیچر انیلا نے دوپٹہ جھاڑنا شروع کر دیا۔ دوپٹے پر نہ چھپکلی تھی، نہ ظاہر ہوئی۔ اس سے پہلے کہ احمد کلاس سے بھاگ نکلتا ٹیچر کی کرخت آواز احمد کی سماعت سے ٹکرائی۔

''احمد! رکو۔'' اب احمد کے پاس کوئی چارہ نہ تھا، اس لیے اس کو رکنا پڑا۔ ارسلان اور امجد کچھ فاصلے پر چھپ کر یہ تمام منظر دیکھ رہے تھے۔ ٹیچر انیلا دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے، احمد!'' احمد بری طرح ڈر چکا تھا اس لیے اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ ''میں نے پوچھا، یہ سب کیا ہے۔'' ٹیچر انیلا نے سپاٹ لہجے میں دوبارہ پوچھا۔ ''و...... و...... وہ...... ٹی...... ٹیچر!'' احمد کے منہ سے یہی الفاظ بمشکل نکل سکے۔ ''وہ...... وہ کیا؟'' ٹیچر نے پوچھا۔

اس بار احمد نے جلدی سے جواب دے دیا۔ ''ٹیچر دراصل آج یکم اپریل ہے۔'' ''یکم اپریل ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم ٹیچرز کے ساتھ ایسا مذاق کرو۔'' ''نہیں ٹیچر! وہ آج اپریل فول ہے نا!'' احمد نے جواب دیا۔ "What?" ٹیچر انیلا کے منہ سے یہ لفظ جلدی سے نکلا۔ ''جہاں تک مجھے معلوم ہے تو یہ اپریل فول انگریزوں کی رسومات کا حصہ ہے۔ یہ مسلمانوں میں کہاں سے گھس آیا؟'' ٹیچر انیلا کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا اور احمد چپ چاپ سر جھکائے تمام ڈانٹ سن رہا تھا۔ ٹیچر انیلا کچھ دیر احمد کو گھورتی رہیں اور پھر پیار سے گویا ہوئیں۔ ''احمد بیٹا! اوپر دیکھو۔'' اب احمد کو قدرے اطمینان ہوا کہ ٹیچر انیلا کا غصہ کم ہو چکا ہے اس لیے اس نے جرأت کر کے ٹیچر سے سوال کیا۔ ''ٹیچر اس میں کیا بری بات ہے؟ جس طرح میں اپنے گھر میں اپنا برتھ ڈے مناتا ہوں اسی طرح اپریل فول بھی مناتا ہوں۔''

''نہیں بیٹا! ہم مسلمان انگریزوں کی رسومات کی نقل کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی رسومات کی نقل نہیں کرنی چاہیے۔ جس طرح انگریز ہماری رسومات کی نقل نہیں کرتے، اسی طرح ہمیں بھی ان کی رسومات کی نقل نہیں کرنی چاہیے۔ کیا انگریز ہماری رسومات عیدالفطر اور عید الاضحیٰ وغیرہ مناتے ہیں؟ نہیں نا! اسی طرح ان تمام رسومات کو منانے سے فضول خرچی بھی ہوتی ہے اور قرآن پاک میں فضول خرچ کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح آپ اپنی برتھ ڈے مناتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں آپ کی زندگی کا ایک سال کم ہو گیا ہوتا ہے۔ ان تمام کاموں سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ جو رسومات ہمارے مذہب اسلام میں شامل ہیں، انہیں پر عمل کریں۔ وہی کام کریں جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو۔'' احمد یہ تمام باتیں بڑے غور اور توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹیچر سے وعدہ کیا کہ وہ اب کبھی بھی فضول رسمیں نہیں منائے گا۔ ارسلان اور امجد بھی ٹیچر انیلا کے پاس چلے آئے اور انہوں نے بھی ٹیچر سے معافی مانگی۔ چونکہ اب یہ تینوں لڑکے سمجھ چکے تھے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط تو ٹیچر انیلا کی تجویز پر اس تین افراد پر مشتمل گروپ کا نام بدل کر گڈ بوائز گروپ رکھ دیا گیا۔

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

سمندروں کا بادشاہ

(محمد یوسف وحید، خان پور)

آج سے کئی سو سال پہلے کی بات ہے۔ ترکی اور اسپین کے درمیان سمندر پر ایک بحری ڈاکو کی حکمرانی تھی۔ وہ گٹھا ہوا جسم، مضبوط بدن کا ایک طاقتور جوان تھا جس کا نام سن کر بڑے بڑے ماہر جہاز ران اور تجارتی جہازوں کے مالک کپکپاتے تھے۔ ایک دفعہ وہ بحری قافلے کو لوٹ کر قریبی ساحلی بستی کی طرف آیا۔ اس کے آتے ہی بستی کے سارے بازار دکانیں بند ہوگئیں۔ لوگ گھروں میں چھپ گئے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو ڈر سے گودوں میں چھپالیا۔ پوری بستی میں موت کا سناٹا تھا۔

ڈاکوؤں کا سردار اور اس کے ساتھی دہشت دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ اچانک سب ڈاکوؤں کے قہقہے رک گئے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئیں کیونکہ ان کے سامنے ایک کمزور سی بوڑھی عورت تن کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی جرأت و بہادری اور بے باکی دیکھ کر سردار کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، اس کے سامنے بڑے بڑے جی دار آنے سے گھبراتے تھے۔ آج اس کے سامنے ایک کمزور سی عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، بوڑھی عورت کی گرج دار آواز سنائی دی۔

''شرم کرو شیطان کے چیلو! ڈوب مرو! تمہیں کسی کا خوف نہیں؟'' یہ بات سن کر قزاق نے ایک جھٹکے سے تلوار بے نیام کی اور بڑھیا کی طرف لہرا کر کہا۔ ''بڑھیا! تو مجھے خوف دلاتی ہے شاید تو نہیں جانتی تو کس کے سامنے کھڑی ہے۔'' بڑھیا نے برجستہ جواب دیا: ''خوب جانتی ہوں تجھے۔ تو ایک باغی اور غلام ہے۔'' بڑھیا کا جواب سن کر سب ورطہ حیرت میں ڈوب گئے۔ سردار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ''میں اور غلام...... ہا ہا...... بھلا مجھے کون غلام بنا سکتا ہے؟ ہا ہا......'' بڑھیا بے خوفی سے بولی۔ ''تو باغی ہے اللہ کا اور غلام ہے شیطان کا اور اپنی نفسانی خواہشات کا۔ کتنا خوب صورت تیرا نام ہے مگر تو اپنے نام کی لاج بھی نہ رکھ سکا۔ ارے ظالم! کمزوروں کو لوٹنا کوئی بہادری نہیں، یہ ظلم ہے بہادری تو تیری تب ہوتی جب تیری تلوار اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لیے اٹھتی۔ تیری آخرت سنوارتی اور تیرا نام لوگوں کے لیے دہشت اور خوف کے بجائے نیک لفظوں میں یاد رکھتے۔ تیری یہ بہادری اور دہشت اللہ کی راہ میں خرچ ہوتی۔ تیرا بدن اللہ کی راہ میں زخمی ہوتا۔ آج تیری تلوار جو اک کمزور بڑھیا پر اٹھی ہے، کسی طاقتور کافر پر اٹھتی تو تیری مردانگی تھی۔'' بڑھیا کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بحری قزاق کے کانوں میں اترے اور دل پر اثر کر گئے۔ اس کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی۔ تلوار نیام میں ڈالی، گردن جھکائی، اپنے ساتھیوں سمیت جہاز پر آگیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ بڑھیا کے کہے ہوئے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں سنائی دے رہے تھے۔

پھر دنیا نے دیکھا، وہ بحری قزاق جو قافلوں کو لوٹا کرتا تھا آج اسلام کا علمبردار بن گیا۔ وہ سمندر کی موجوں پر کسی مست مچھلی کی طرح کفر کا مقابلہ کرنے لگا، کافروں کے لیے وہ دہشت بن گیا۔ اس نے کئی ساحلوں علاقوں کو، جو کافروں کے پاس تھے، فتح کیے۔ یہ مسلمانوں کا مشہور امیر البحر خیرالدین بار بروسا تھا۔ یہ اپنی داڑھی میں سرخ مہندی لگایا کرتا تھا۔ پرتگالی زبان میں سرخ داڑھی والے کو ''پرپوزا'' کہتے ہیں۔ ترکی زبان میں یہ لفظ ''بار بروسا'' تھا۔ یہ اس کے نام کا جزو بن گیا تھا یعنی ''سرخ داڑھی والا۔'' 1533ء میں یہ ترکی بحری بیڑہ میں شامل ہوگیا۔ اس نے اپنے تمام علاقے ترکی کے بادشاہ کو تحفتاً پیش کیے۔ جب یہ ڈاکو تھا تو تب بھی یہ امیر تھا۔ جب یہ سیدھی راہ پر چلا تو خدا نے اس کو عزت اور شان عطا کی۔ آج بھی اس کا نام تاریخ میں اچھے لفظوں میں لیا جاتا ہے۔ ترکی بحری بیڑے میں شامل ہو کر اس نے تیونس کو فتح کیا۔ ترکی کے بادشاہ نے اس کو ''پاشا'' کا لقب دیا۔ ترکی میں پاشا کو بادشاہ کا سب سے معزز سمجھا جاتا ہے۔

امیر البحر خیرالدین پاشا بار بروسا کی قیادت میں ترکی بحری بیڑہ نے بحیرہ روم پر متعدد حملے کیے اور شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ الجزائر کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا اور اپنے دور میں ترکی کو سب سے بڑی بحری طاقت بنا دیا۔ 1546ء میں اسلام کا یہ عظیم فرزند استنبول میں 90 سال کی عمر میں فوت ہوا۔

محنت میں وہ جوانوں جیسا تھا۔ سلطان نے اس کی قبر سمندر کے کنارے بنوائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے...... آمین۔

سچ ہے جس نے خیر اور نیکی کا راستہ اپنایا وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

(تیسرا انعام: 90 روپے کی کتب)

''روہیم کے ابو، آپ نے دیکھا کہ روہیم اب بالکل بدل گیا ہے۔ دو تین ماہ سے میں یہ بات نوٹ کر رہی ہوں کہ وہ میری ہر بات مان رہا ہے۔ کبھی کبھی تو میرے پاؤں دبانے لگ جاتا ہے۔ کام میں میری مدد بھی کرتا ہے۔'' امی نے حیرانی سے خبر سنائی۔

''ہاں! میں نے بھی نوٹ کیا ہے کہ وہ اب پہلی جیسی حرکتیں نہیں کرتا۔ یہ تبدیلی آخر ممکن کیسے ہوئی؟'' ابو نے بھی اظہار خیال کیا۔

''مجھے خود معلوم نہیں، اسی لیے تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔'' امی نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''روہیم سے بات کی تم نے اس بارے میں؟'' ابو نے چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے کہا۔

''جی کی تھی۔''

''کیا کہتا ہے وہ؟''

''وہ کہتا ہے آپ میری ماں ہیں۔ آپ کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔''

''اچھا!!!!'' ابو نے حیرانی سے کہا۔

''اس کو ہو کیا گیا ہے؟'' ابو نے پریشانی سے پوچھا۔

''آپ کے لاڈ پیار نے ایسا بنا دیا ہے۔ میری بات تو سنتا ہی نہیں ہے۔'' امی نے بھی طنز کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے خیال میں اس کا کچھ علاج کرنا ہوگا۔'' ابو نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔

''اس خیال کو عملی جامہ بھی پہنا دیں۔ دو مہینے ہو گئے، آپ یہی بات کر رہے ہیں۔'' امی نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ یہ خود ہی سدھر جائے گا لیکن اب کچھ کرنا پڑے گا۔'' ابو نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے روہیم کے بارے میں بہت فکر مند ہو رہے تھے۔ دونوں کے لاڈ پیار نے روہیم کو بہت ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔ روہیم ہر بات پر اپنی امی سے ضد کرتا تھا۔ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ امی کے لیے وہ وبال جان ثابت ہو رہا تھا۔ چند دن پہلے ہی روہیم کے ابو کو آئی نائن کے رہائشی علاقے میں ایک گھر الاٹ ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ کرایہ کے گھر میں رہتے تھے۔ اس علاقے میں ضروریات زندگی کی ہر سہولت میسر تھی۔ فلیٹ میں آنے کے بعد انہوں نے ایک کمرہ اپنے لیے اور ایک کمرہ روہیم کو دے

دیا اور تیسرے کمرے کو مہمان خانہ بنا دیا۔ آج تو روہیم نے حد ہی کر دی تھی۔ کھانے کی میز پر اپنا پسند کا کھانا نہ دیکھ کر کھانا ہی پھینک دیا جس پر اُس کے ابو نے اُسے تھپڑ رسید کر دیا۔ روہیم غصے میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور زور سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

روہیم بڑے غصے میں بیٹھا اپنا ہوک ورک کر رہا تھا کیوں کہ کچھ دیر پہلے ہی اُس کی امی کے ساتھ جھڑپ ہوئی تھی۔ روہیم کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ استری کو دیکھ کر روہیم کو اسکول یونی فارم استری کرنے کا خیال آیا۔ الماری سے اسکول یونی فارم نکالنے لگا تو کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ روہیم نے نیچے دیکھا تو ایک بوسیدہ سی ڈائری پڑی ہوئی تھی جن کے صفحے ہوا کی وجہ سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ روہیم نے ایک نظر اُس ڈائری کی طرف دیکھا جس پر گرد کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ روہیم نے یونی فارم ایک طرف رکھا اور ڈائری کو نیچے سے اُٹھایا۔ ڈائری کا بغور معائنہ کرنے کے بعد وہ اس حتمی فیصلے پر پہنچا کہ یہ ڈائری اُس کی نہیں ہے۔

اس دوران امی کی آواز آئی: ”بیٹا! آ کر کھانا کھا لو۔“ یہ سننے کے لیے وہ بے قرار تھا۔ اس لیے جلدی سے دروازہ کھول کر امی اور ابو کے پاس چلا گیا جو اُس کا کھانے پر انتظار کر رہے تھے۔ امی نے روہیم کے ہاتھوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! پہلے ہاتھ دھولو۔ کتنی مٹی لگی ہوئی ہے۔“

روہیم کو یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ روہیم نے ایک غصے والی نگاہ اپنی امی کی طرف ڈالی اور باتھ روم میں ہاتھ دھونے چلا گیا۔ ہاتھ دھونے کے بعد کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کھانے کے دوران روہیم کا دھیان ڈائری کی طرف ہی تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ڈائری روہیم کے ہاتھ میں تھی۔ بستر پر تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو یہ سوچنے لگا کہ یہ اتنی پرانی ڈائری ہے کس کی، آخر میں یہ خیال آیا کہ ڈائری پڑھ کر دیکھ لیتا ہوں، جس کی ہو گی، پتا چل جائے گا۔ روہیم نے اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ڈائری کو آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا۔

ڈائری کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا۔ ”ماں کے نام۔“

دوسرا صفحہ پلٹا تو اُس صفحہ پر چند سطور لکھی ہوئی تھیں جسے وہ پڑھنے لگا۔ ”میری ماں جی کا نام آمنہ اختر ہے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میری ماں ہیں۔ اُنہوں نے میری ہر جگہ، ہر مقام پر مدد و رہنمائی کی ہے۔ میرے چار بھائی اور ایک بہن ہے۔ اس کے برعکس مجھے لگتا ہے کہ میری ماں میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ میری چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرتی ہے۔ اس لیے میری ماں دنیا کی بہترین ماں ہے۔“

یہ صفحہ پڑھنے کے بعد روہیم نے اپنی ماں کے بارے میں سوچا۔ اُس کی ماں بھی اُسے بے انتہا چاہتی ہے۔ اُس کی تمام خواہشات پوری کرتی ہیں۔ روہیم نے ڈائری کے مختلف صفحوں کو پلٹایا۔ ایک صفحے کی تحریر پر اُس کی نظر ٹھہر گئی، وہ اُسے پڑھنے لگا۔

”جب میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا، ڈرائنگ کے پیریڈ میں مجھے ہوم ورک کے لیے رنگ بھرنے کا کام ملا۔ ماں جی نے مجھے ہوم ورک کے بارے میں پوچھا اور اپنی رہنمائی میں سارا کام مکمل کروایا۔ اسکول میں ڈرائنگ کی میڈم نے ہوم ورک چیک کیا۔ ڈرائنگ میں رنگ زیادہ بھرنے کی وجہ سے میڈم نے مجھے مارا تھا، جس کی وجہ سے میرا چہرہ ٹماٹر کی طرح لال ہو گیا تھا۔ جب یہ بات ماں جی کو پتا چلی تو وہ سیدھا میڈم کے پاس گئیں۔ ماں جی نے کہا کہ میرے بچے کو آپ پیار سے بھی سمجھا سکتی تھیں۔ یہ بتا سکتی تھیں کہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ اس مار سے تو میرے بچے کا پڑھائی سے دل اُچاٹ ہو جائے گا۔ میڈم نے بھی معذرت کرتے ہوئے اپنے رویے پر افسوس کا اظہار کیا۔“

روہیم کو یہ صفحہ پڑھتے ہوئے اپنا واقعہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اُس کی امی نے بھی کچھ اس طرح کے جواب میڈم کو دیے تھے۔ روہیم نے ڈائری کو ایک دفعہ پھر سرسری نظروں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ چند صفحات کے بعد ایک صفحہ پر اُس کی نگاہ رک گئی۔

اُس صفحہ پر لکھا تھا۔ ”آج اسکول میں اقبال ڈے منایا جا رہا تھا۔ اس لیے کوئز پروگرام، تقاریر اور خاکے پیش کیے جانے تھے۔ اقبال ڈے کے پروگرامات میں میں نے حصہ لیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے کوئز پروگرام شروع ہوا۔ اس میں میرے دو جماعت کے اور بھی

تھے۔ ہم سب نے کوئز کی بہت اچھی تیاری کی تھی، اس لیے کوئز میں دوم انعام کے حق دار ٹھہرے۔ دوستوں اور استاد صاحبان نے میری کامیابی پر حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد تقریری مقابلوں میں بھی تیسری پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ میری خوشی دیدنی تھی۔ جب میں نے گھر والوں کو بتایا تو کسی کے منہ سے حوصلہ افزائی کے چند الفاظ بھی نہیں نکلے۔ صرف میری ماں جی نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اُس دن میری پسند کے کھانے بنے۔ ماں جی کی وجہ سے وہ دن بہت خوب صورت بن گیا تھا۔"

روہیم نے ڈائری کو بند کرتے ہوئے خود کلامی کی۔ "لگتا ہے اس ڈائری کو میرے سارے حالات کا پہلے سے علم ہے۔" دوسرا خیال یہ آیا۔ "شاید یہ ڈائری جس لڑکے کی ہو، وہ میری طرح کا ہو۔" اس طرح کے بے شمار خیالات کو جھٹک کر اس نے ڈائری دوبارہ کھولی۔

اس بار جو صفحہ کھلا، اُس پر لکھا تھا۔ "آج کے دن میرا بورڈ کا رزلٹ آنا تھا۔ مجھے اپنے ابو کے فون کا انتظار تھا۔ یہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ دو بجے کے قریب ابو کا فون آیا۔ اُنھوں نے روکھے لہجے میں کہا کہ تمھارا A گریڈ آیا ہے۔ اگر زیادہ محنت کرتے تو +A گریڈ بھی آ جاتا۔ یہ بات سن کر میں رونے لگا۔ امی نے میرے رونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے بتایا کہ A گریڈ آیا ہے۔ امی نے میرا ماتھا چوم کر پیار کیا۔ میری بلائیں لیں۔ اپنے پرس سے 100 روپے کا نوٹ نکال کر دیا اور کہا کہ میری طرف سے پاس ہونے کی خوشی میں کھا پی لینا۔"

"روہیم باہر آؤ اور چائے پی لو۔ آج تمھاری پسند کے بسکٹ بھی ہیں۔" امی نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

روہیم نے ڈائری ایک طرف رکھی اور اُٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ یہ دیکھ کر امی کو خوشی ہوئی کہ ایک بار بلانے پر ہی آ گیا ورنہ تو دو تین آوازوں کے بعد بھی وہ کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ آخر یہ حادثہ کیسے ہو گیا۔ روہیم نے آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر چائے پی۔ چائے پیتے ہوئے اچانک اُس نے چائے کی تعریف کی۔ چائے ختم کرنے کے بعد وہ اُٹھا اور امی کو کہنے لگا: "شکریہ امی اتنی پیاری چائے پلانے کا۔"

روہیم کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس بدلتے ہوئے رویہ کو دیکھ کر امی پریشان ہو رہی تھیں۔

آج روہیم بہت خوشی خوشی گھر جا رہا تھا کیوں کہ اس نے میٹرک کے بورڈ کے امتحان میں تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس پوزیشن کو حاصل کرنے کے لیے روہیم نے دن رات محنت کی تھی۔ اس دوران روہیم کی امی نے بھی روہیم کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔ روہیم کو اس بات کا بخوبی علم ہو چکا تھا کہ میری امی میرے لیے ہمیشہ اچھا ہی سوچتی ہیں۔ امتحان کے دنوں میں اُنھوں نے میرا کتنا خیال رکھا ہے۔ اب اُسے جلدی تھی تو صرف گھر پہنچنے کی۔ روہیم کے امی ابو نے اُسے تیسری پوزیشن حاصل کرنے پر مبارک باد دی۔ روہیم اسکول یونی فارم تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یونی فارم تبدیل کرنے کے بعد وہ اپنی کتابوں کو ترتیب سے رکھنے لگا۔ ان کتابوں کے درمیان اُس کی نظر ڈائری پر پڑی جس کے چند صفحات نے اُس کے ذہن میں آنے والے سوالات کا جواب دیا تھا۔

روہیم نے ڈائری کو کھولا اور ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک صفحہ پر لال رنگ کا گہرا نشان بنا ہوا تھا اور نیچے کالے پن سے لکھا تھا۔ "آج میرے دوست شعیب اعوان کی والدہ وفات پا گئی ہیں۔ شعیب کو پہلے تو اپنی والدہ کی کوئی قدر و قیمت سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے اپنے کام وقت پر مل جاتے تھے۔ اُس کی تمام چیزوں کو اس کی امی سنبھال کر رکھتی تھی۔ جب وہ دنیا سے چلی گئی تو اُسے اپنی امی کی قدر کا شدت سے احساس ہوا۔ ایک دن شعیب نے مجھ سے کہا کہ جو چیز پاس ہوتی ہے انسان اُس کی قدر نہیں کرتا لیکن جب وہ دُور ہو جائے تو اُس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ اب مجھے اپنی امی کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ مجھے اپنے کام خود کرنے پڑتے ہیں۔ شعیب کی یہ بات سن کر میں اپنی امی کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتا ہوں۔ ان کو وقت پر دوا دیتا ہوں۔ کبھی کبھی پاؤں دبانا اور سر دبانا، میری عادت بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ مجھے ابھی میری ماں جی چاہیے۔"

روہیم نے ڈائری بند کی اور اپنے اندر جھانکا۔ روہیم کو اپنی غلطیاں تصویروں کی طرح تبدیل ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ روہیم

سوچنے لگا کہ ماں کہتے کسے ہیں؟ یہ اب مجھے سمجھ آیا ہے۔ روہیم کے ذہن میں فوراً ایک بُرا خیال آیا کہ اگر اللہ نہ کرے، میری ماں جی فوت ہو جائیں تو میرا کیا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو موتیوں کی طرح بہنے لگے۔ روہیم سے مزید ڈائری کے صفحات پڑھے نہیں جا رہے تھے۔ پھر بھی ڈائری کے آخری صفحات پڑھنے لگا۔ ورق گردانی کرتے ہوئے روہیم آخری صفحہ پر پہنچ گیا۔ آخری صفحہ پر کچھ اس طرح تحریر تھا۔ ''آج میرا ایم ایس سی کا رزلٹ نکلنا تھا۔ میں پاکستان کی مشہور قائداعظم یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔ جب رزلٹ نکلا تو میں نے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ میری قابلیت کو دیکھتے ہوئے ایک یونی ورسٹی نے مجھے لیکچرر کی نوکری دے دی۔ آج کل میں اُس یونی ورسٹی میں طالب علموں کو پڑھا رہا ہوں۔ یہ سب کچھ مجھے میری ماں جی کی دعاؤں کے صلے میں ملا ہے۔ میری ماں نے ہمیشہ میری کامیابی و کامرانی کی دعا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے میری درخواست ہے کہ وہ میری ماں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین!''

ڈائری کے آخر میں ڈائری کے مالک کا نام اور فون نمبر بھی لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوٹ بھی تھا۔

''اگر کبھی میری یہ ڈائری گم ہو جائے تو براہ مہربانی مجھے واپس کردیں۔ یہ ڈائری میرے لیے بہت قیمتی اثاثہ ہے۔ شکریہ!''

''روہیم بیٹا! ذرا میرے پاس آنا۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' ابو نے آواز دی۔

''اچھا ابو جی!'' روہیم نے جواب میں کہا۔

کچھ دیر کے بعد روہیم اُن کے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹا! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔'' ابو نے روہیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی...... ابو...... کوئی......'' روہیم سے الفاظ پوری طرح ادا نہیں ہو رہے تھے۔

''تمہاری امی بتا رہی ہیں کہ چند ماہ سے تمہارا رویہ بالکل تبدیل ہوگیا۔'' ابو نے بات کی۔

''اوہ...... اچھا...... یہ بات ہے۔'' روہیم نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''چلو اب جلدی بتاؤ، تم میں یہ تبدیلی کیسے آگئی۔'' امی سے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی لیا۔

''امی جان! چند مہینے پہلے مجھے ایک ڈائری ملی تھی۔ اُس میں ایک مسلم شریف کی حدیث نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ: ''حضور ﷺ ایک دن بیان فرما رہے تھے کہ میرے تابعین میں سے ایک ایسا تابعی، اویس قرنیؒ ہے جس سے اگر مغفرت کی دُعا کروا سکو تو ضرور کروانا۔ آپ ﷺ سے اس کی وجہ پوچھی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ میرے پاس اس لیے نہیں آسکتے ہیں کہ ان کی ماں بہت ضعیف ہیں اور وہ اکیلا اُن کو چھوڑ کر جا نہیں سکتے۔ جب کبھی وہ مدینہ آئیں تو اُن سے اپنی مغفرت کی دعا ضرور کروا لینا۔''

حضرت اویس قرنیؒ کی جب ماں وفات پا گئی تو وہ فوراً مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچنے پر علم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں۔ حضرت اویس قرنیؒ کے پہنچنے کی اطلاع حضرت عمرؓ کو ملی تو وہ اُن سے ملنے گئے اور اُن سے اپنی مغفرت کی دعا کروائی۔'' روہیم نے واقعہ ختم کرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور دوبارہ بولنے لگا۔ ''رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت اویس قرنیؒ کو عزت افزائی صرف اور صرف ماں کی خدمت اور عیادت کرنے سے ملی ہے۔ اس لیے میں اپنے گذشتہ رویہ کی آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں نے آپ سے بہت بُرا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے بھی سچے دل سے توبہ کر لی ہے۔''

امی نے خوشی سے روہیم کو گلے سے لگا لیا۔

روہیم کے ابو نے سکون کا سانس لیا کہ روہیم کو ماں کی قدر و قیمت کا احساس ہوگیا ہے۔ روہیم کو علم ہوگیا تھا کہ ماں اللہ تعالیٰ کی طرف ایک انمول نعمت ہے جو اُسے ملی ہیں۔

کچھ دن بعد روہیم نے ڈائری اُس کے مالک تک پہنچا دی اور ڈائری کے آخر میں یہ لکھ دیا کہ ''والدین کو مسکرا کر دیکھنا، صدقہ جاریہ ہے۔''

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اس بار تعلیم و تربیت 30 مارچ ہی کو موصول ہو گیا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنی کوشش میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ تعلیم و تربیت کا معیار دن بہ دن بلند سے بلند تر ہو رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ پورا رسالہ ہمارے نوخیز بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نہ صرف ابھارتا ہے بلکہ درست سمت میں بھی نشوونما کرتا ہے۔

(شاہین ارشد، تاندلیانوالہ)

☆ آپ کی دعاؤں اور حوصلہ افزائی کا بہت شکریہ۔ آپ کی تجاویز اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔

اپریل کا شمارہ 29 مارچ ہی کو مل گیا تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میں تعلیم و تربیت کے شروع کے تمام شمارے خریدنا چاہتا ہوں۔

(محمد عرفان، سیال کوٹ)

☆ تعلیم و تربیت کے شمارے حاصل کرنے کے لیے سرکولیشن منیجر سے رابطہ کریں۔

مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے 9 ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے لیکن آج تک میرا کوئی خط شامل نہیں ہوا، اس کی کیا وجہ ہے؟ چچا تیز گام نے سرکس دیکھی کے علاوہ سارا شمارہ ہی سپرہٹ رہا۔

(ہاشم خاں ہاشی، رضوان علی فردوس، مٹیلہ)

میں پہلی بار آپ کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ میں یہ رسالہ تین چار سال سے پڑھ رہی ہوں۔ پلیز میرا خط ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکیے گا ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ گزشتہ ماہ کے شمارے میں ''غریبوں کا آقا'' ٹاپ پر تھی۔

(ثناء رانی، گجرات)

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ دعا، شاہد اور اس کے دوست، شریر بندر اچھی کہانیاں تھیں۔ سرورق بھی بہت پسند آیا۔

(محمد حذیفہ انوار، محمد اسامہ یعقوب، جھنگ)

میں تعلیم و تربیت دو سال سے پڑھ رہا ہوں لیکن خط پہلی بار لکھا ہے۔ تمام کہانیاں دلچسپ تھیں۔ کہانی بھیج رہا ہوں۔ ضرور شائع کیجیے گا۔

(سعد ارشد، سیال کوٹ)

یہ میرا پہلا خط ہے۔ اپریل کا شمارہ وقت پر مل گیا۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ زہر، میٹھے میاں، کھٹے میاں کی چھٹیاں، جھوٹوں کا بادشاہ اور نظم موسم بہار بہت مزے کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

(علینہ اظہر، اسلام آباد)

میں آپ کا شمارہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ سلسلہ ''سنہرے لوگ'' میں نسیم حجازی کے بارے میں مضمون شائع کریں۔

(محمد اجمل شاہین، لاہور)

☆ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔

اپریل کا سرورق بہت اچھا تھا۔ بہت مزا آیا۔ تمام کہانیاں عمدہ تھیں۔

(محمد واصف، بہاول پور)

اپریل کا شمارہ بہت جلد مل گیا تھا۔ میں تعلیم و تربیت کا بہت پرانا قاری ہوں۔ میں نے تعلیم و تربیت کے مزید پانچ قارئین بنا لیے ہیں جن میں محمد عامر، احمد، ولید، اجمل اور منیب شامل ہیں۔

(عبدالمعم، سمندری، فیصل آباد)

مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ میں چار سال سے پڑھ رہی ہوں۔ کہانیاں جھوٹوں کا بادشاہ، شریر بندر، سیاچین، شاہد اور اس کے دوست اور چچا تیز گام نے سرکس دیکھی زبردست تھیں۔

(واہبہ تنویر، سیال کوٹ)

کیا حال ہیں آپ کے؟ اپریل کا شمارہ جلد مل گیا اور بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ میں نے تو دو دن میں ہی پڑھ لیا تھا۔ بچے بڑے سب اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ کھٹے میاں، میٹھے میاں کی چھٹیاں، سیاچین، جھوٹوں کا بادشاہ، غریبوں کا آقا اور شریر بندر بہت اچھی لگیں۔

(عیشہ افضل، گوجرانوالہ)

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ساری کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ سرگرمیاں بہت اچھا سلسلہ ہے، اسے جاری رکھیے گا۔

(حفصہ خان، لاہور)

اپریل کا شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ اس بار جلد مل گیا۔ کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ زہر، جھوٹوں کا بادشاہ بہت اچھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ترقی دے۔ (محمد قاسم، مردان)

اپریل کا شمارہ اپنی دل کش تحریروں، پُر از معلومات، مضامین سے مزین اور آراستہ و پیراستہ ملا۔ سرورق اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ اداریہ پڑھ کر سبق حاصل ہوا۔ حمد و نعت جیسے گلشن محبت میں بہار آ گئی۔ زہر کہانی ایک سنگین مسئلے پر لکھی گئی ہے۔ مضمون جوانوں کو میری آہ سحر دے پڑھ کر خون سنسنانے لگا۔ تمام تحریریں دل کو چھو لینے والی تھیں۔ (خدیجہ نشان، کامونکی)

اپریل کا شمارہ ہمیشہ کی طرح نہایت دلچسپ تھا اور سرورق نے اس میں خوب صورت رنگ بکھیر دیے۔ تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں قاری کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں میں بھی شامل ہو جاؤں۔ (علشبہ نورین، لاہور)

☆ **آپ کی تحریریں ہمیں مل گئی ہیں۔ معیاری ہوئیں تو ضرور شائع کی جائیں گی۔**

آج کا تعلیم و تربیت وہی ہے جو 25 سال پہلے میں نے پڑھا تھا اور تربیت حاصل کی۔ آج میری بیٹی 12 سال کی ہے۔ اس کے لیے پہلی بار یہ رسالہ لیا ہے اور آپ کی کاوشوں اور حوصلوں کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ تربیت سب سے مشکل کام ہے مگر آپ جس انداز سے ملک کے نونہالوں کی تربیت کر رہے ہیں وہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ (اشرف تواب، راول پنڈی)

☆ **آپ کی حوصلہ افزائی اور دعاؤں کا بہت بہت شکریہ۔ امید ہے کہ آپ کی بیٹی علینہ احمد بھی تعلیم و تربیت پڑھتی رہیں گی۔ آپ کی تجاویز اور رائے کا انتظار رہے گا۔**

آپ کا رسالہ ہمارے گھروں میں بہت مقبول اور پسندیدہ ہے۔ میرے بچے بہت خوش ہو کر پڑھتے ہیں۔ یقین کریں میں بھی بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس میں بہت ہی اچھے سلسلے ہیں۔

(مسز ساجد شیخ، اوکاڑہ)

☆ **آپ کا خط ملا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ اپنی تجاویز بھیجیں۔**

اپریل کا شمارہ تعریف کے لائق ہے۔ زہر، پیارے اللہ کے پیارے نام، جھوٹوں کا بادشاہ بہت پسند آئیں۔ دعا بھی سبق آموز تھی۔ انعام معلومات سے بھرپور تھی۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ سارا شمارہ زبردست ہے۔ میں تعلیم و تربیت کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

(اروی معطر بیگ، گجرات)

اپریل کے شمارے کا سرورق بہت اچھا تھا۔ تمام تحریریں عمدہ تھیں۔ زہر، کھٹے میاں، میٹھے میاں اور دعا پسند آئیں۔ مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ (ماہ نور عثمانی، کراچی)

تعلیم و تربیت بچوں کے لیے ایک معلوماتی اور تفریحی رسالہ ہے۔ مارچ کے شمارے میں کہانیاں اور معلومات قابلِ تعریف ہیں۔ مہربانی کر کے میرا خط ضرور شامل کریں۔ (شیر زمان، پشاور)

میں تعلیم و تربیت کا خاموش قاری ہوں اور پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ ہر ماہ مجھے تعلیم و تربیت کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ (محمد احمد، جواد گل جگنو، چشتیاں)

اپریل کا شمارہ بہت ہی دل کش تھا۔ انعامی سلسلوں کا بہت بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ بلاعنوان سے دل خوش ہو جاتا ہے۔ سلسلہ ''آپ بھی لکھیے'' میں کہانی کس طرح شائع کی جاتی ہے۔

(حافظ عائشہ جمیل، کراچی)

☆ **''آپ بھی لکھیے'' کے لیے اپنی کہانی ارسال کیجیے۔ معیاری ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔**

کیسے ہیں آپ؟ اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ یہ آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میرے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ ضرب المثل کہانی بہت اچھی تھی۔ شریر بندر، شاہد اور اس کے دوست، جھوٹوں کا بادشاہ پڑھ کر مزا آیا۔ (اسامہ ظفر راجہ، سرائے عالم گیر)

تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ ہمارے گھر میں جو مہمان آتے ہیں وہ بھی تعلیم و تربیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ (کومل امجد، ملتان)

اپریل کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ دو مہینے پہلے میں نے آپ کو خط لکھا تھا مگر آپ نے شائع نہیں کیا۔ ماہنامہ میں دلچسپ قسط وار سفرنامہ شروع کیا جائے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ میں نے اور میری بہن نے سالانہ امتحان میں بہت اچھے نمبر لیے ہیں۔ امید ہے آپ ہماری کامیابی کے لیے دعا کریں گے۔ (مناہل افضل، لاہور)

کوریا کی کہانی

سعید لخت

چٹکی بھر کوڑا!

کسی گاؤں میں ایک مال دار بیوہ رہتی تھی۔ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا اور وہی اس کی ساری جائے داد اور دھن دولت کا مالک تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو ماں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی لیکن وہ اپنے بیٹے کے لیے ایسی سگھڑ اور گھر گرہستن بہو لانا چاہتی تھی جیسی وہ خود تھی۔

اُسے ایسی پھوہڑ، بدسلیقہ اور نکمی لڑکیوں سے سخت چڑ تھی جو کام کریں کم اور باتیں کریں زیادہ۔ جو دن بھر سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی دیواروں کو تکتی رہیں اور اپنے پھوہڑ پن سے جنت کو بھی دوزخ بنا دیں۔

بڑھیا نے گاؤں میں نظر دوڑائی تو کوئی ایسی لڑکی دکھائی نہ دی جو اس کی نظر میں جچتی۔ سوچنے لگی، کیا کروں؟ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے کسان عورت کا بھیس بدلا، ٹھیلے میں شکر کی دو بوریاں لادیں اور قریب کے قصبے میں جا کر آواز لگانے لگی: ''لے لو! لے لو! کوڑے کے بدلے شکر۔ لے لو! کوڑے کے بدلے شکر۔''

دیکھتے ہی دیکھتے ٹھیلے کے آس پاس مجمع لگ گیا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ بڑھیا کا دماغ چل گیا ہے۔ جبھی ایسی بے تکی حرکتیں کر رہی ہے۔ کوئی سڑک پر سے کوڑا اٹھا لایا اور کوئی نالیوں میں سے کیچڑ نکال لایا۔ بڑھیا نے اُن سب کو بھگا دیا۔ اس نے کہا: ''مجھے سڑکوں اور گلیوں کا کوڑا نہیں، گھر کا کوڑا کرکٹ چاہیے۔ جو لڑکی گھر میں جھاڑو دے کر کوڑا میرے پاس لائے گی، میں اتنی ہی شکر تول کر اُسے دے دوں گی۔''

یہ سننا تھا کہ محلے کی تمام لڑکیوں نے جھاڑو سنبھال لی اور گھر کی صفائی شروع کر دی۔ کوئی دس سیر کوڑا لے کر آئی، کوئی سات سیر اور کوئی پانچ سیر۔ بڑھیا نے اُن سب کو شکر دے دی۔ غرض تیسرے پہر تک شکر کی دونوں بوریاں خالی ہو گئیں اور اُن کی جگہ، ٹھیلے میں، اتنا ہی کوڑے کا انبار لگ گیا۔

جو لڑکی دس سیر کوڑا لائی تھی، بڑھیا نے اُس سے پوچھا: ''شاباش ہو، بیٹی! تمہارے گھر سے روز اتنا ہی کوڑا نکلتا ہے؟''

لڑکی لہک کر بولی: ''ارے اماں جی، روز اتنا کہاں نکلتا ہے۔ روز تو میں بس آگے آگے سے جھاڑو لگا دیتی ہوں۔ کونے بچالے صاف نہیں کرتی۔ آج شکر کے لالچ میں، گھر کے سارے کونے کھدرے صاف کر ڈالے۔ تبھی تو اتنا کوڑا نکلا ہے۔''

''جگ جگ جیو میری چندا!'' بڑھیا نے کہا۔ ''تمہارے بابا جان کیا کام کرتے ہیں؟''

لڑکی بڑے فخر سے بولی: ''جی، وہ میونسپلٹی میں صفائی کے

انسپکٹر ہیں۔"

جب محلے کی تمام لڑکیوں کو بڑھیا نے دیکھ لیا تو اُس نے ٹھیلا آگے بڑھایا۔ اسے ان میں سے ایک لڑکی بھی پسند نہیں آئی تھی۔ بھلا جن لڑکیوں کے گھروں سے دس دس پانچ پانچ سیر گوڑا نکلے، انہیں کوئی سلیقہ مند کہہ سکتا ہے؟

بڑھیا ٹھیلا دھکیلتی ہوئی آگے بڑھی تو اچانک اسے ایک لڑکی نظر آئی۔ کامنی سی، من موہنی سی۔ وہ دروازے میں کھڑی بڑی حسرت سے بڑھیا کو دیکھ رہی تھی۔

بڑھیا نے پوچھا: "اے بیٹی، تم شکر لینے نہیں آئیں؟"

لڑکی آہ بھر کر بولی: "میرے گھر میں اتنا گوڑا نکلا ہی نہیں۔ یہ دیکھو! بس اتنا سا ہے۔" اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا بڑھیا کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس کے بدلے کتنی شکر ملے گی؟"

بڑھیا نے غور سے لڑکی کو دیکھا۔ شکل وصورت تو بس واجبی سی تھی، لیکن سلیقہ، تمیز اور سگھڑاپا اُس کے روم روم سے ٹپکتا تھا۔ کپڑے معمولی تھے، مگر بڑے صاف ستھرے۔ سر کے بال نہ تو جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بالکل خشک اور نہ ایسے جیسے سر پر کڑوے تیل کی پوری بوتل اوندھائی گئی ہو۔

وہ ہنسی تو منہ میں جھل جھل کرتی موتیوں کی لڑیاں نظر آئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صبح شام دانت مانجھتی ہے۔ بڑھیا نے اس کے ہاتھ اوپر اٹھائے تو ان میں سے نہ پیاز کی بو آئی اور نہ لہسن کی۔ اس کا مطلب تھا وہ مسالا پیس کر فوراً صابن سے ہاتھ دھولیتی ہے۔

بڑھیا کو یہ لڑکی بڑی پسند آئی۔ اس نے پوچھا: "بیٹی، تم مجھے اپنا گھر دکھاؤ گی؟"

لڑکی بولی: "ارے بڑی اماں، بڑے شوق سے۔ آیئے، تشریف لایئے۔"

بڑھیا نے گھر میں قدم رکھا تو آنکھیں روشن ہوگئیں۔ سارا گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ کسی چیز پر گرد تھی، نہ مٹی۔ پھر ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی ہوئی۔ مجال ہے جو باورچی خانے کی چیز کمرے میں اور کمرے کی چیز باورچی خانے میں رکھی ہو۔ لڑکی کے چھوٹے بھائی بہن بھی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے...... اور ماں بھی دُھلی دُھلائی چارپائی پر پڑی تھی۔

بڑھیا کبھی گھر کو دیکھتی اور کبھی لڑکی کی آنکھوں ہی آنکھوں میں بلائیں لیتی۔ لڑکی نے اسے چارپائی پر بٹھایا اور منٹوں میں ٹھنڈے میٹھے شربت کا گلاس لے آئی۔ اتنے میں بڑھیا نے لڑکی کی ماں سے بات کر لی تھی۔ شربت پی کر بڑھیا اٹھی اور لڑکی کی ماں سے کہنے لگی: "اچھا تو بہن، بات پکی۔ اس جمعے میں منگنی کرنے آؤں گی اور اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو اپنی بہو کو گھر لے جاؤں گی۔"

اقوال زریں

☆ زبان کی لغزش قدم کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہے۔
☆ اس دن پر آنسو بہاؤ، جو دن تم نے بغیر نیکی کے گزار دیا۔
☆ بدترین شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوں۔
☆ اللہ اُس پر رحم کرتا ہے جو اللہ کے بندوں پر رحم کرتا ہے۔
☆ اصل بات برداشت کرنے میں ہے، انتقام لینے میں نہیں۔

شہزادی سارہ، لاہور

دریافتیں

ٹارنٹو مکڑا

ٹارنٹو کے نام سے جانے والے اس مکڑے کی دریافت حال ہی میں ہوئی ہے جس پر ٹائیگر کی طرح کی دھاریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ برازیل کی ریاست ایکرے میں پایا جاتا ہے جو سب سے زیادہ اقسام کے حیوانات کا مسکن ہے۔

کوبرا کے پھن پھیلانے کا راز کھل گیا

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جب بھی کوبرا اپنا پھن پھیلاتا ہے تو اس کی پسلیاں اور اس کے پٹھے اسے یہ شکل اپنانے میں مدد دیتے ہیں۔

سورج کے ذرات لانے والا کیپسول تباہ

سورج سے نکلنے والے ذرات جمع کر کے زمین پر لانے والے جینیس خلائی مشن سے بھیجا گیا۔ کیپسول امریکہ میں پیراشوٹ نہ کھلنے کے سبب زمین سے ٹکرا گیا۔

یہ کیپسول مقررہ وقت پر زمین کی فضا میں داخل ہوا لیکن اس سے جڑا ہوا پیراشوٹ کھل نہیں سکا اور وہ زمین سے ٹکرا گیا۔ کیپسول کو فضا میں پکڑنے کے لیے ہالی وڈ کے سٹنٹ پائلٹ فضا ہیلی کاپٹروں پر موجود تھے تاکہ کیپسول کو بہ سہولت زمین پر اتار سکیں۔ اس کیپسول میں موجود ذرات کو جمع کرنے میں تحقیقاتی خلائی جہاز جینیس نے خلاء میں تین سال صرف کیے تھے۔

آٹھواں عجوبہ

ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن کے ایک ٹاؤن ہال میں عجیب وغریب گھڑیال نصب ہے۔ قیاس ہے کہ آئندہ تین سو سال تک صرف 4 یا 10 سیکنڈ آگے جائے گا۔ اس گھڑیال کا وزن 4 ٹن ہے اور اس کے ایک لاکھ دس ہزار پرزے ہیں۔ یہ ایک ولندیزی گھڑی ساز جینز لوئس کی عمر بھر کی محنت کا پھل ہے۔ اس کے نتائج پانچ مختلف ڈائلوں اور مستطیل نما کیلنڈر پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ڈائل اور کیلنڈر سال اور مہینے کے نام ظاہر کرتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے کا مقامی وقت اس گھڑیال کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔ ولندیزی گھڑی ساز اس کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہتے ہیں۔

تیرہ سالہ لڑکے نے ایورسٹ سر کرلیا

تیرہ سالہ امریکی لڑکے جورڈن رومیرو کے گھر والوں نے بتایا ہے کہ رومیرو نے دنیا کی بلندترین چوٹی ایورسٹ سر کر لی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اتنی کم عمری میں یہ کارنامہ کسی نے پہلے انجام نہیں دیا۔ رومیرو کی والدہ نے کیلیفورنیا سے بتایا کہ رومیرو نے انہیں دنیا کی بلندترین چوٹی سے فون کیا ہے۔ ''ماں! میں آپ کو دنیا کے سب سے اونچے مقام سے فون کر رہا ہوں۔''

ان کی والدہ نے کہا کہ رومیرو اپنے والد اور تین نیپالی گائیڈوں کے ساتھ ہے۔ اس سے پہلے سب سے کم عمری میں ایورسٹ سر کرنے کا اعزاز ایک سولہ سالہ نیپالی لڑکے کے پاس تھا۔

☆☆☆

سلسلہ ''کھوج لگائیے'' میں ان بچوں کے جوابات بھی درست تھے

صغیر حسین، سرائے سدھو۔ محمد اعظم جمشید، اوکاڑہ۔ عاطف بشیر، قصور۔ صبا ندیم، اسلام آباد۔ زعیم یاسر، لاہور۔ سیف الاسلام، اوتھل۔ محمد شہریار، شاہ کوٹ۔ سیف اللہ، قصور۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ علشباء فاروق، ملتان۔ نمرہ شکیل، ملتان۔ عائشہ محمد رفیق، گوجرانوالہ۔ نور سحر، واہ کینٹ۔ حباء مجتبیٰ، لاہور۔ محمد اکمل رفیع، جہلم۔ زینب حسین، گوجرانوالہ۔ کامران ہمایوں، لاہور۔ تابندہ نعیم، اسلام آباد۔ محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ جویریہ ریاض، اسلام آباد۔ عیشہ حیاء، لاہور۔ مہوش ملک، خانیوال۔ بریرہ فاطمہ، گوجرانوالہ۔ حمنہ ماہین، راول پنڈی۔ محمد ذیشان، ڈیرہ غازی خان۔ نورالعین ظفر، لاہور۔ انیزہ مظفر، لاہور۔ فاطمہ الماس، اسلام آباد۔ محمد حسن خالد، سرگودھا۔ بلال احمد، حسن ابدال۔ مناہل شاہد، ملتان۔ آصفہ عطاریہ، روڈ شکر گڑھ۔ محمد حامد رضا قادری، کامونکی۔ تنویر بشیر احمد، رائے ونڈ۔ فاطمۃ الزہراء، رحیم یار خان۔ عبداللہ ہاشمی، لاہور۔ ردا حبیب، اسلام آباد۔ ماہ نور فاطمہ اعوان، اسلام آباد۔ محمد فصیح، کامرہ کینٹ۔ ثناء جمال، اسلام آباد۔ محمد زوہیب رمضان، کھرڑیانوالہ۔ مومنہ زیدی، فیصل آباد۔ حافظ محمد یوسف کشمیری، ملتان۔ حرا عمیر، لاہور۔ سارہ امیر، راول پنڈی۔ ثناء رانی، گجرات۔ زوبیا رضی، کراچی۔ حسن ارشاد، وہاڑی۔ محمد بن مظفر، گوجرانوالہ۔ عبداللہ طارق وٹو، بہاول نگر۔ حمید ظفر، تاندلیانوالہ۔ رامین نصرت، بہاول پور۔ ارحم خان، سیال کوٹ۔ سید حسین حیدر، کہوٹہ۔

خطرناک روشنی

راول پنڈی چھاؤنی کے سرے پر کیپٹن ندیم احمد کا خوب صورت بنگلا تھا۔ کیپٹن ندیم کی عمر پچیس سال تھی۔ آج اپریل کی پہلی تاریخ تھی اور اس کے بنگلے سیمیا میں بلال احمد کی سال گرہ منائی جا رہی تھی۔ بلال جو رشتے میں ندیم کا چچا لگتا تھا۔ عمر میں ندیم سے چار سال چھوٹا تھا۔

بلال اور ندیم کا گہرا دوست ضرار بھی آ چکا تھا۔ ہر چیز تیار تھی۔ تمام مہمان ہال میں جمع تھے اور ندیم، بلال اور ضرار کا انتظار کر رہے تھے۔

اتنے میں وہ تینوں ہال میں داخل ہوئے۔ مہمانوں نے تالیاں بجائیں جن کا جواب تینوں نے یوں ہاتھ ہلا ہلا کر دیا جیسے وہ تینوں قومی رہ نما ہیں۔

ندیم نے آتے ہی ایک میز پر ہاتھ رکھ کر تقریر شروع کر دی:

خواتین و حضرات! آج فسٹ اپریل ہے اور ہمارے چچا بلال نے جنم لینے کے لیے آج کا دن ہی پسند کیا تھا۔ گویا بلال کا پیدا ہونا بھی ایک مذاق ہے۔ (تالیاں)

خواتین و حضرات! یہ دن صرف اسی لحاظ سے اہم نہیں ہے کہ آج بلال کی سال گرہ ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی بڑا مبارک ہے کہ مسٹر بلال کو ہوا بازی کی تعلیم دینے والے استادوں نے ان کو ہوا بازی کے تمام امتحانوں میں نمایاں کام یابی کا خط بھی آج ہی بھیجا ہے۔ (تالیاں)

میں بلال کو اپنی اور آپ سب کی طرف سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (تالیاں) اب سال گرہ کا کیک کاٹا جاتا ہے۔

کیک کاٹا گیا اور سب نے مل کر ”ہیپی برتھ ڈے ٹو یو“ گایا۔ کافی دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ گلی میں سے ایک گدھے کے رینکنے کی آواز آئی تو بلال نے ایک دم ضرار کی طرف مڑ کر کہا۔ ”آپ نے کچھ کہا؟“ اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔ اب آہستہ آہستہ سب لوگ واپس جا رہے تھے۔ ایک کونے میں شیخ صاحب اپنے ایک بوڑھے دوست سے باتیں کر رہے تھے۔ بلال قریب سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کار کو الٹا چلاتے ہوئے بنگلے سے باہر لے جا رہا ہے۔ بلال جھٹ بول اٹھا۔ ”دیکھیے شیخ صاحب، کیا الٹا زمانہ آ گیا ہے۔ اب موٹریں الٹی چلنے لگی ہیں۔“ شیخ صاحب اور ان کے بوڑھے دوست دیر تک ہنستے اور کھانستے، کھانستے اور ہنستے رہتے۔

تقریباً سوا آٹھ بجے تک سب مہمان جا چکے تھے۔ مہمانوں کے دیے گئے تحفوں کو ضرار، بلال اور کیپٹن ندیم تینوں دیکھ رہے

تھے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ندیم لپک کر اپنے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر لکھا 462/9934..0048,0048۔ ندیم کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

''کیا بات ہے کیپٹن؟'' بلال اور ضرار نے پوچھا۔

''کوئی ڈاکٹر صاحب ہیں جو اپنا نام سروش بتاتے ہیں۔ مری کی طرف جائیں تو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ان کا بنگلا ہے۔ انھوں نے مجھے ہندسوں میں ایک پیغام لکھوایا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔''زندگی خطرے میں ہے۔فوراً پہنچو۔فوراً پہنچو۔''

''دراصل ہمارے کنبے میں ایک مدت سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ جب کوئی لڑکی یا لڑکا پچیس سال کا ہوتا ہے تو اسے ہم آپس میں ایک دوسرے کو پیغام دینے کے لیے خفیہ ہندسوں کی ایک فہرست رٹا دیتے ہیں اور اس کا استعمال ہمارے کنبے کے لوگوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

چاجی کو تم جانتے ہی ہو گے ضرار؟ ان کا اصل نام عبدالعزیز ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر رہے ہیں۔ میں بہت چھوٹا سا تھا تو ان کو چچا جی کے بجائے چاجی کہتا تھا۔ اس وقت سے میں ان کو چاجی ہی کہتا ہوں۔ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ اگر معمولی خطرہ ہوتا تو میں کل صبح یہاں سے روانہ ہوتا لیکن اب میں کسی صورت بھی نہیں رک سکتا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

ندیم اپنے کمرے میں گیا اور ریوالور نکال کر جیب میں ڈال لیا۔ ضرار اور بلال بھی تیار ہو چکے تھے۔ بلال نے گاڑی بنگلے سے نکال لی تھی اور وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ندیم اور ضرار کود کر کار میں جا بیٹھے۔ گھرر...... گھرر...... شوں...... اور گاڑی مری کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ ندیم بولا:

''ضرار، میں تمھیں چاجی کا ذرا تفصیل سے تعارف کراتا ہوں۔ تمھیں آج تک ان سے ملاقات کا موقع اس لیے نہیں مل سکا کہ چاجی سیلانی طبیعت کے انسان ہیں۔ اکثر وطن سے باہر سیر وسیاحت میں وقت گزارتے ہیں۔ میں خود دو سال کے بعد ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ غالب اور اقبال کے ہزاروں شعر انھیں یاد ہیں۔ یہ میرے حقیقی چچا نہیں بلکہ میرے والد صاحب کے بچپن کے دوست ہیں۔ ان کا ہمارے کنبے کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ رہا ہے کہ اب ہم انھیں رشتے داروں سے کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

راول پنڈی سے مری کی طرف جائیں تو 25 میل کے فاصلے پر دائیں ہاتھ کو ایک چھوٹی سی سڑک پھوٹتی ہے۔ اس سڑک پر دس میل چلنے کے بعد ایک بستی ہے جس کا نام فردوس ہے۔ یہاں زیادہ تر افسروں کے بنگلے ہیں۔ انھی میں سے ایک بنگلا چاجی کا ہے جس کا نام جنت نگاہ ہے۔ فردوس میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اور آب و ہوا بے حد فرحت بخش ہے۔''

گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ سات میل...... آٹھ میل...... نو میل...... اور دس میل۔

''اس طرف...... اس نیلے بنگلے میں۔'' ندیم نے بلال سے کہا۔

''شوں...... کھٹک۔'' اور گاڑی ڈاکٹر سروش کے بنگلے کے سامنے ٹھہر گئی۔ بلال نے ہارن بجایا اور ڈاکٹر سروش ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑے باہر آئے۔

ندیم نے اپنا تعارف کرایا۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں پھر ڈاکٹر صاحب نے لفافہ ندیم کو دے دیا۔ خدا حافظ کہہ کر تینوں گاڑی میں بیٹھے...... اور گاڑی مری کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

ندیم نے لفافہ کھولا۔ اس میں لکھا تھا:

محترم کیپٹن ندیم صاحب!

پروفیسر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ جب فردوس میں داخل ہوں تو احتیاط برتیے۔ ''جنت نگاہ'' کے گرد عجیب قسم کی مخلوق منڈلا رہی ہے۔ اگر نیلی روشنی نظر آئے تو اس سے بچیے۔ یہ بے حد خطرناک ہے۔ باقی باتیں ملاقات پر معلوم ہوں گی۔

آپ کا آصف

''یہ آصف کون ہے؟'' ضرار نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' ندیم نے مختصر سا جواب دیا۔

گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ
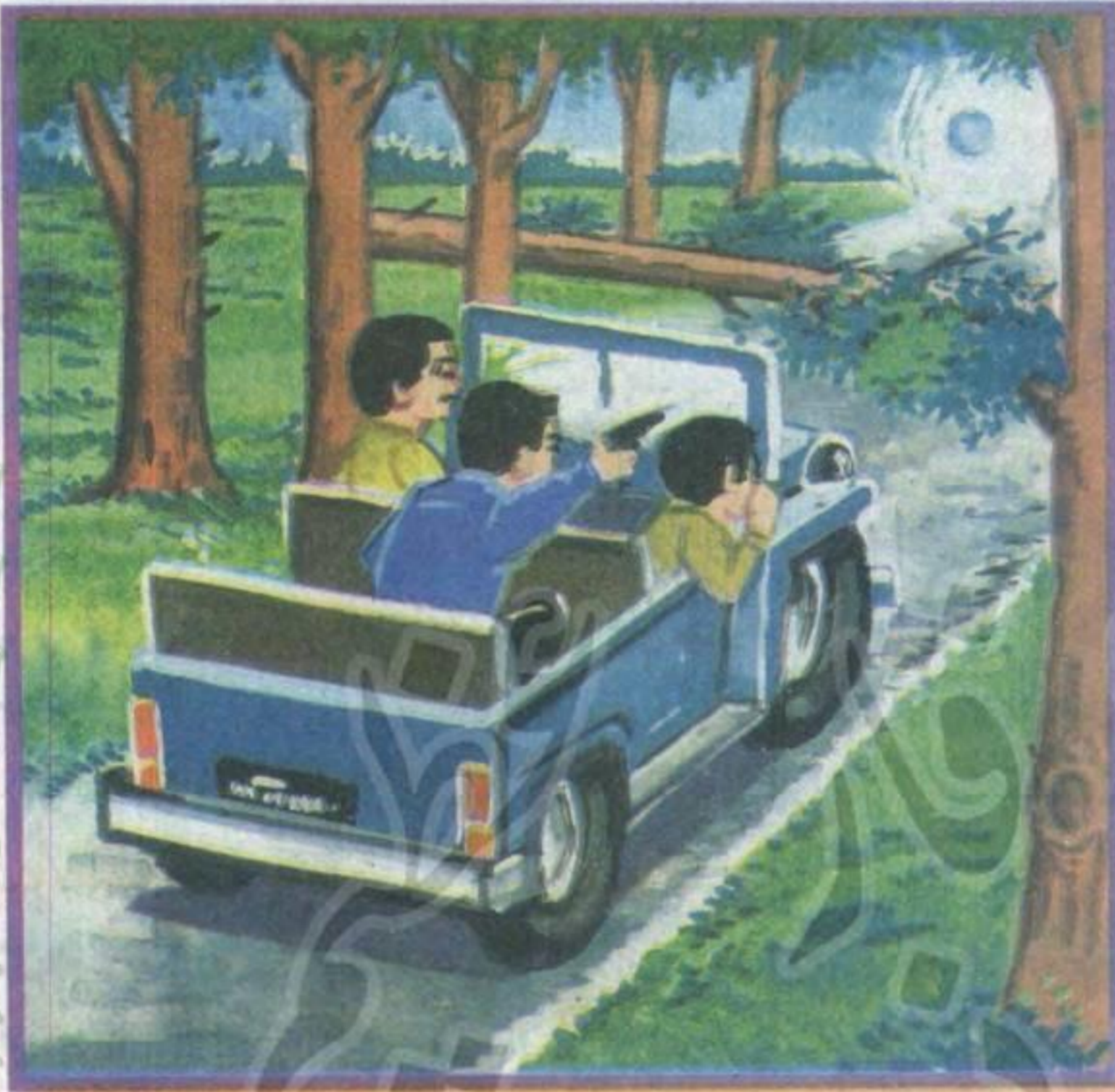
فردوس میں داخل ہو گئے۔ ایک پختہ سڑک جس کی لمبائی ایک ہزار گز ہوگی، سیدھی جنت نگاہ پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اب گاڑی اس سڑک پر آ چکی تھی۔

"بریک لگاؤ!" ندیم زور سے چلایا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ راستے میں ایک درخت سڑک کے آر پار گرا ہوا تھا۔ اگر گاڑی اس سے ٹکرا جاتی تو انھیں شدید چوٹیں آتیں۔ گاڑی درخت سے فقط چار انچ پرے رک گئی تھی۔ تینوں گاڑی سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"وہ......وہ دیکھو...... نیلی روشنی۔" ضرار چلایا۔

ان سے پچاس گز کے فاصلے پر نیلی روشنی کا ایک بادل سا آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ندیم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور نیلے بادل کا نشانہ لینے لگا۔ "ٹھا ٹھا" اس نے دو فائر کر دیے اور جب تیسرا فائر کرنے لگا تو اس بادل سے ایک نیلی کرن نکلی اور ندیم کے ہاتھ پر پڑی۔ ندیم زمین پر گر گیا۔ اس کا ہاتھ سن ہو چکا تھا اور ریوالور دُور جا گرا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ندیم ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ "کیپٹن ہوش میں آؤ۔" ضرار نے ندیم کا بازو جھنکتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے ندیم کھڑا ہو گیا۔

"بھاگو! ضرار، بلال بھاگو۔ نیلی روشنی سے بچو۔ اس طرف آؤ میرے پیچھے۔" اور تینوں درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بھاگے۔ انھیں سر پیر کا کوئی ہوش نہ تھا۔ راستے میں ضرار نے کہا:

"ہماری کار کا کیا بنے گا؟"

"لعنت بھیجو کار پر، اس وقت جان بچاؤ۔" ندیم نے جواب دیا۔

ہانپتے کانپتے وہ کوٹھی کے لان میں داخل ہو گئے۔ اندر باہر کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور دروازے بھی اندر سے بند تھے۔

"ادھر آؤ بلال، اس دیوار کی طرف منہ کر کے اور اس پر ہاتھ ٹیک کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمھارے کندھوں پر کھڑے ہو کر اس کھڑکی کا شیشہ توڑتا ہوں۔"

ندیم نے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور کمرے میں کود گیا۔ پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور تینوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ ندیم نے سگریٹ لائٹر جلایا۔

"اُف میرے اللہ۔" ندیم نے کہا۔ "کمرہ تو اسلحہ خانہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ٹیبل لیمپ تو ذرا جلانا۔" ضرار نے لپک کر لیمپ جلا دیا۔ ندیم بولا:

"یہ رہی ہاتھی مارنے والی بندوق۔ اس الماری میں دو بندوقیں اور کارتوسوں کی پیٹیاں ہیں۔ یہ بارہ بور کی دو نالی بندوق ہے۔ ضرار یہ تم لے لو۔ یہ پستول میں اپنے لیے رکھتا ہوں۔ بلال تم بھی اپنی پسند کی بندوق لے لو۔ اوہ! یاد آیا، دروازہ تو ہم کھلا چھوڑ آئے ہیں...... جانا ضرار۔"

اچانک کوٹھی کے لان میں سے کسی کی خوف ناک چیخ سنائی دی۔ تینوں دروازے کی طرف بڑھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نیلا بادل کسی شخص کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ شخص اندھیرے میں ایک سایہ سا معلوم ہوتا تھا اور چیختا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہونے کی

کوشش کر رہا تھا۔

''شوٹ کر دو۔ شوٹ کر دو۔'' وہ شخص چلایا۔

ضرار نے بغیر سوچے سمجھے نیلے بادل کے درمیانی حصے پر دو فائر کر دیے۔ ''ٹھاٹھا'' دونوں گولیاں نیلے بادل میں جا کر لگی تھیں۔ بادل نے ایک جھرجھری لی اور پھر غائب ہو گیا۔

اندھیرے میں بھاگنے والا شخص اب کوٹھی کے دروازہ کے قریب آ گیا تھا۔ ''ٹھہرو، کون ہو تم؟ ہینڈز اپ۔'' ندیم چلایا۔

سایہ ٹھہر گیا۔ اس نے ہاتھ بلند کیے اور کہا۔ ''میں...... میں آصف ہوں۔''

''کون آصف؟ ہم کسی آصف واصف کو نہیں جانتے۔'' ندیم نے ڈانٹ کر کہا۔

''مجھے قریب آنے کا موقع دیں۔ میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔'' سایہ بولا۔

ندیم نے اسی طرح رعب دار آواز میں کہا۔ ''اگر تم شرارت کی نیت سے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ۔ ورنہ ہماری گولیاں تمھارا جسم چھلنی کر دیں گی۔''

''نہیں نہیں۔ میں آپ کا دوست ہوں۔'' سایہ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

وہ شخص دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے تینوں سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ''میں پروفیسر عبدالعزیز کے مرحوم دوست کا لڑکا آصف ہوں۔ میرے والد ریاست حیدر آباد کے ایک نواب تھے۔ میں پروفیسر عبدالعزیز کے ہاں ہی رہتا ہوں۔ میں نے ہی آپ کو ڈاکٹر سروش کے ہاں پیغام بھیجا تھا اور......''

''یہ کیا گڑ بڑ ہے؟'' پروفیسر عبدالعزیز سیڑھیاں اترتے ہوئے بولے۔

''السلام علیکم چاچی۔'' ندیم نے گردن گھما کر پروفیسر کو سلام کیا۔

''میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ آؤ اوپر میرے کمرے میں چلو۔ وہاں چل کر باتیں ہوں گی۔''

اوپر جا کر چاچی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ ندیم اور آصف قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بلال اور ضرار بھی ذرا پرے کھڑکیوں کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''باہر کا دھیان رکھنا۔'' ندیم نے بلال اور ضرار سے کہا۔

''فکر نہ کرو کیپٹن۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''آصف بیٹے، تم ان کے لیے کوفی تیار کرو۔'' پروفیسر نے کہا اور آصف کوفی تیار کرنے چلا گیا۔

''بھئی ندیم، تم کہتے ہو گے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے میں تمھیں ابھی بتائے دیتا ہوں لیکن ٹھہرو پہلے تھوڑا سا تعارف ہو جائے اور پھر میں بتاؤں گا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ سچ پوچھو تو ندیم بیٹے، زندگی کے بارے میں یہ مصرع کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔''

''کون سا مصرع چاچی؟'' ندیم نے پوچھا۔

پروفیسر نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی

''چاچی ذرا اس کا مطلب بھی بتا دیجیے۔'' بلال کھڑکی کے قریب سے بولا۔

''کون ہے یہ؟ بلال! ارے شریر، مجھے یاد ہے تو میری ترکی ٹوپی کے پھندنے میں کانٹا اڑس کر ٹوپی کھینچ کر بھاگ جایا کرتا تھا...... ادھر آ شیطان۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔''

چاچی نے بلال کو پیار کیا۔

''چاچی اس مصرعے کا مطلب کیا ہے؟'' بلال نے پھر پوچھا۔

''ہاں اس کا مطلب ہے بیٹا کہ خطروں میں گر کر زندگی گزارنے کا نام ہی زندگی ہے...... اور یہ دوسرے صاحب کون ہیں؟''

''چاچی، اس کا نام ہے داستان گو۔'' ندیم نے کہا۔

''داستان گو؟...... یہ کیا نام ہوا بھلا؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''دراصل میرا نام ضرار ہے۔ کیپٹن مجھے داستان گو کہا کرتے ہیں، حالاں کہ اب میں نے داستانیں سنانی چھوڑ دی ہیں۔'' ضرار بولا۔

''چچا جان! کوفی تیار ہے۔'' آصف نے برتنوں کو میز پر سجاتے ہوئے کہا۔ اس نے ہر ایک کے آگے کوفی کی ایک ایک پیالی رکھ دی۔ ندیم نے ضرار کا تعارف کرایا۔ پھر چاچی نے حسب عادت ایک دو شعر پڑھے اور آصف کا تعارف کرانے لگے۔

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 مئی 2013ء ہے۔
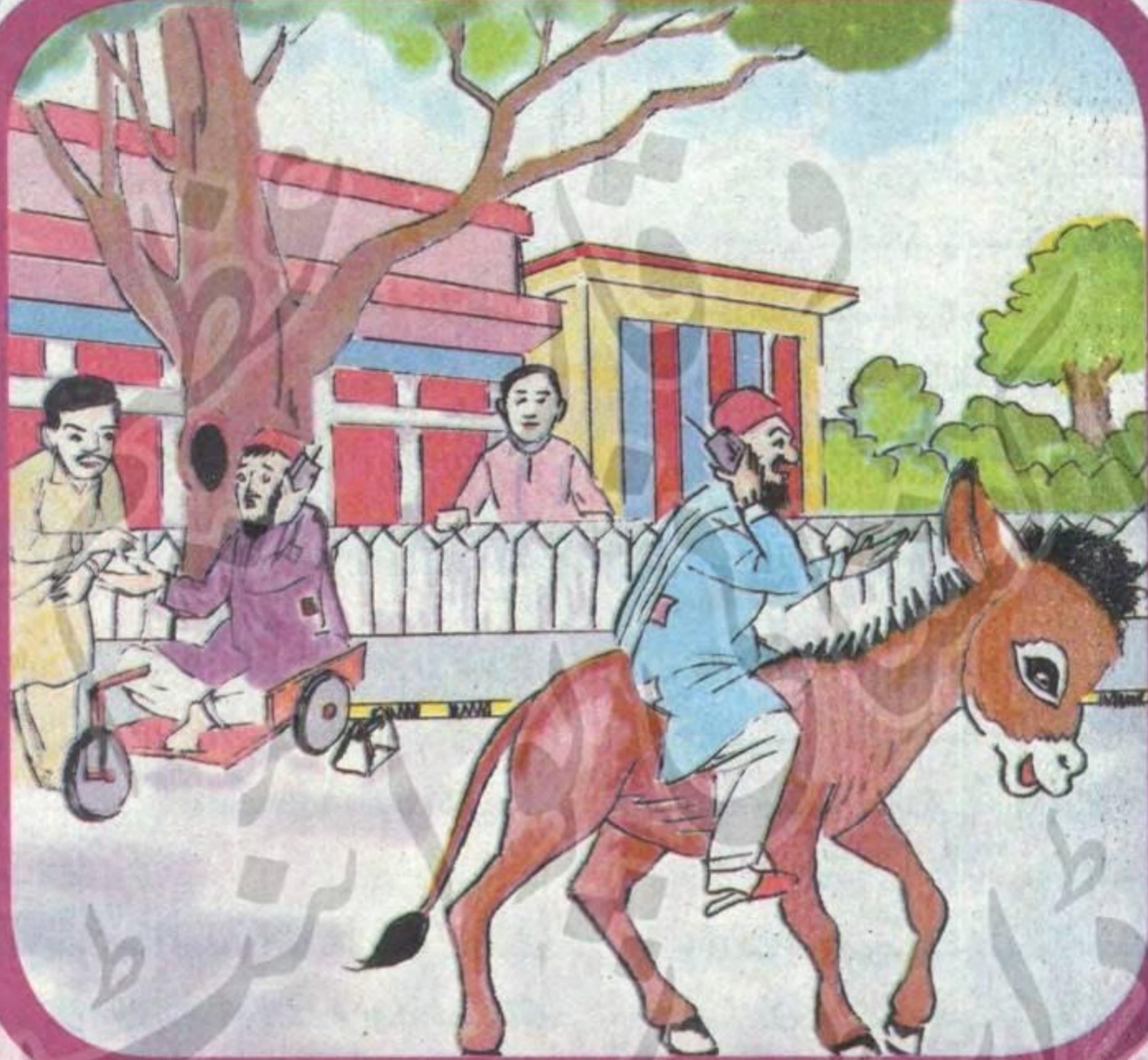
اپریل 2013ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- جنگل میں ہوا منگل، جب ہوا بلی چوہے کا دنگل (عائشہ رفیق، گوجرانوالہ)
- بلی اور چوہے کی لڑائی، دیکھنے کو سب شیدائی (محمد انیق اسد، اسلام آباد)
- آ دیکھیں ذرا کس میں کتنا ہے دم (عبدالشکور، فیصل آباد)
- ٹام اینڈ جیری کی جنگ، ہر بچے بوڑھے کی پسند (صوفیہ عبداللہ، پشاور)
- بلی نے کی لڑائی، چوہے کی شامت آئی (فاطمہ علوی، فیصل آباد)